اشاعت کا ۹۶واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مئی ۲۰۱۸ء

۱۰؍روپے

سلام بن رزاق

زین الدین حیدر، عارف محمود

شینوا اچیبے، جے ایم سالی

تبسم فاطمہ، فضل حسنین، سلیم اختر، داؤد احمد

محمد قمر سلیم، گل جبین اختر، عبدالصبور قدوائی

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں کی تاریخ پیدائش (مئی)

حیات اللہ انصاری

اختر شیرانی

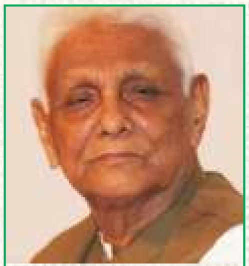

ظفر گورکھپوری

قاضی عبدالودود

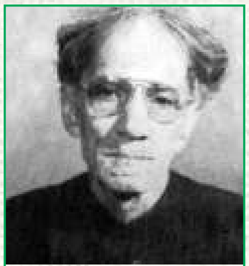

مجنوں گورکھپوری

سعادت حسن منٹو

بلونت سنگھ

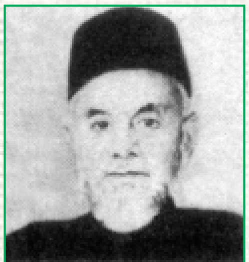

ملا واحدی

وزیر آغا

ساجدہ زیدی

حفیظ بنارسی

شاہد احمد دہلوی

داغ دہلوی

سریندر پرکاش

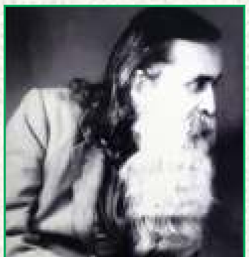

دیویندر ستیارتھی

حیات اللہ انصاری	یکم مئی ۱۹۱۱	۱۸؍فروری ۱۹۹۹
پروفیسر علی محمد خسرو	یکم مئی ۱۹۲۵	۲۴؍اگست ۲۰۰۳
مغیث الدین فریدی	یکم مئی ۱۹۲۵	۱۵؍جولائی ۲۰۰۱
اختر شیرانی	۴؍مئی ۱۹۰۵	۹؍ستمبر ۱۹۴۸
ظفر گورکھپوری	۵؍مئی ۱۹۳۵	۳۰؍جولائی ۲۰۱۷ء
قاضی عبدالودود	۸؍مئی ۱۸۹۶	۲۵؍جنوری ۱۹۸۴
مجنوں گورکھپوری	۱۰؍مئی ۱۹۰۴	۸؍اگست ۱۹۸۸
سعادت حسن منٹو	۱۱؍مئی ۱۹۱۲	۱۸؍جنوری ۱۹۵۵

ابرار حسنی گنوری	۱۱؍مئی ۱۸۹۸	۷؍نومبر ۱۹۷۳
اشرف صبوحی	۱۱؍مئی ۱۹۰۵	۲۲؍اپریل ۱۹۹۰
بلونت سنگھ	۱۵؍مئی ۱۹۳۰	۲۷؍مئی ۱۹۸۴
ملا واحدی	۱۷؍۱۸۸۸	۲۲؍اگست ۱۹۷۶
شفیق فاطمہ جعفری	۱۷؍مئی ۱۹۳۰	۱۶؍اگست ۲۰۱۲
عادل منصوری	۱۸؍مئی ۱۹۳۶	۶؍نومبر ۲۰۰۸
وزیر آغا	۱۸؍مئی ۱۹۲۲	۷؍ستمبر ۲۰۱۰
ساجدہ زیدی	۱۸؍مئی ۱۹۲۷	۹؍مارچ ۲۰۱۱

ہیرانند سوز	۱۹؍مئی ۱۹۲۲	۷؍جنوری ۲۰۰۲
حفیظ بنارسی	۲۰؍مئی ۱۹۳۳	۱۶؍جون ۲۰۰۸
شاہد احمد دہلوی	۲۲؍مئی ۱۹۰۶	۲۸؍مئی ۱۹۶۷
داغ دہلوی	۲۵؍مئی ۱۸۳۱	۱۴؍فروری ۱۹۰۵
میراجی	۲۵؍مئی ۱۹۱۲	۳؍نومبر ۱۹۴۹
سریندر پرکاش	۲۶؍مئی ۱۹۳۰	۸؍نومبر ۲۰۰۲
دیوندر ستیارتھی	۲۸؍مئی ۱۹۰۸	۱۲؍فروری ۲۰۰۳

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۳   شمارہ : ۱

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

مئی ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجول کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِسالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

سرورق: ایس.آر.جائسوال

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِسالانہ : ۱۱۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

مرزا جعفر حسین

تعیش بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا
صفحہ ۴۵

سلام بن رزاق

نارد نے کہا
ص ۱۱

ج.ایم.سالی

عکس
صفحہ ۵۴

شینوا اچیبے

امن کے بعد
صفحہ ۵۱

امرکانت

دوپہر کا کھانا
صفحہ ۴۸

محمد قمر سلیم

ادھورا خواب
صفحہ ۲۸

تبسم فاطمہ

کہیں سے ایک شروعات
ص ۱۵

فضل حسنین

واہ رے مکان
صفحہ ۵۷

عارف محمود

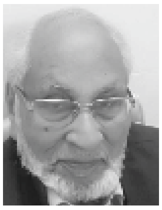

کسوٹی
صفحہ ۳۱

زین الدین حیدر

آغا حشر کاشمیری عظیم ڈرامہ نگار
صفحہ ۶

عبدالصبور قدوائی

رقصاں درخت
صفحہ ۲۱

گل جبین اختر

پورے چاند کی رات
صفحہ ۲۴

سلیم اختر

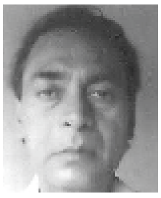

امید
صفحہ ۱۹

داؤد احمد

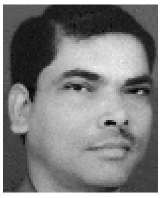

اردو ادب میں نکڑ ناٹک کی روایت
صفحہ ۳

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنا احتساب

گزشتہ برس یہی وہ دن تھے جب ہمیں 'نیا دور' کی ادارت سنبھالنے کی ذمہ داری ملی تھی۔ 'نیا دور' محض ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک وقیع وراثت ہے۔ یہ عظیم وراثت بڑی وسعت کی حامل ہے۔ ہم اس وراثت کو سنبھالنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن ذمہ داری بہر حال ذمہ داری ہوتی ہے۔ خوشی نہیں بلکہ ایک عجیب سی الجھن کے ساتھ ہم نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ 'نیا دور' کی درخشاں تاریخ کی نوک پلک کو جتنا سنوار پائیں گے، سنواریں گے۔ کسی کام کو پروفیشنل دیانت داری سے کرنے کی حتمی ضد سے ہم نے شروع کی تھی 'نیا دور' کی ادارت۔ مئی ۲۰۱۷ء ہمارا پہلا شمارہ تھا اور مئی ۲۰۱۸ء کا یہ تیرہواں شمارہ ہم شائع کر رہے ہیں۔ یعنی ایک سال مکمل ہوگیا۔ اس ایک سال میں 'نیا دور' کے تقریباً سات سو نئے خریدار بن گئے اور ایک ہزار سے زائد سالانہ خریداروں نے اپنی خریداری کی تجدید کرائی۔

گزشتہ ایک سال میں ہم نے کیا کیا، یہ سب کے سامنے ہے اور جتنی بھی تعریف وتوصیف ہمارے حصے میں آئی، اس کا احساس بھی ہے۔ ہم نے ادارت سنبھالتے ہی تہیہ کیا تھا کہ 'نیا دور' کو ہر حال میں ہر مہینے شائع کرنا ہے۔ اس میں ہم کامیاب بھی رہے۔ ایک عزم تھا اور ذمہ داری کا احساس بھی کہ اپنا ہر عمل 'نیا دور' کی اپنی شاندار تاریخی وراثت کے شایان شان ہی رہے۔ ہم نے جو بھی کیا اس میں کچھ عصری تجربات کے ذریعہ اس سلسلہ کو مزید سنوارنے کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی ادب، غیر ملکی ادب، ہندی کہانی، بازدید، گزشتہ لکھنؤ اور گل افشانیاں جیسے مستقل کالم شروع کئے جنھوں نے 'نیا دور' کی تجدید میں اہم رول ادا کیا۔ یہ ایک قسم کی جدید پیکیجنگ کا حصہ ہے۔ ہم نے ہر شمارہ کو کسی نہ کسی شاعر وادیب کی سالگرہ یا وفات سے منسلک کرتے ہوئے شائع کرنے کی کوشش کی اور ہر ماہ اندرپیج پر مایۂ ناز قلمکاروں کی یوم پیدائش اور وفات کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ جتن ادارۂ 'نیا دور' کی ٹیم کی محنت اور لگن کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔

اپنی ایک سال کی ادارت کا ماحصل بڑا دلچسپ ہے۔ جب ہمیں نیا دور ملا تھا تو ہمارے پاس اشاعت کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اردو دنیا سے کنارہ کشی کئے ہوئے تقریباً پندرہ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ خدشہ تھا کہ لوگ پہچانیں گے بھی یا نہیں لیکن اردو ادب کے ان گوشوں اور حلقوں سے بھی زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ جن سے ہم نے کوئی امید نہیں لگائی تھی۔ اگست میں عصمت چغتائی پر مرکوز شمارے کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ لکھنؤ کے محرم کی تہذیبی وراثت پر منحصر رثائی ادب سے بھر پور اکتوبر کے شمارے کا بھی زبردست استقبال کیا گیا۔ نومبر کے شمارے پر ہندوستان کے معروف اخبار (The Hindu) میں مشہور نقاد پروفیسر شافع قدوائی کا تبصرہ شائع ہوا جو کہ اس کے اداریئے اور مشمولات کی تعریف پر تھا۔ دسمبر کا شمارہ ہم نے اردو کے حروف تہجی کی پیچیدگی پر نکالا اور پھر فروری ۲۰۱۸ء میں ندا فاضلی اور بشیر بدر پر جو نمبر شائع ہوا اس کی دھوم مچ گئی۔ مارچ کے شمارے میں پانچ یونیورسٹیوں میں اردو تہذیب پر رپورتاژ کو بھی خوب پسند کیا گیا۔ اپریل کا شمارہ ہم نے گابرئیل گارسیا مارکیز پر مرکوز کیا، اسے بھی خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔

تعریف وتوصیف کے ساتھ ہمیں کچھ کھٹے میٹھے تجربے بھی ہوئے مثلاً فروری کے شمارے سے ہم نے اپنے قلمکاروں کو اسٹار ٹریٹمنٹ دیتے ہوئے ان کی رنگین تصویر کے ساتھ ان کا مختصر تعارف شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ پوری اردو دنیا میں اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اپریل آتے آتے ہمارا تحمل جواب دینے لگا۔ اکثر ادباء وشعراء نے اپنا تعارف ارسال کرنے میں اس قدر نخرے کئے، اتنا زیادہ پریشان کیا کہ فی الحال ہم نے یہ سلسلہ رنجیدگی سے ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کوئی کہتا تھا وکی پیڈیا سے لے لیجئے، کسی نے کہا، میں بایوڈاٹا بھیج رہا ہوں، بنا لیجئے، کسی نے کہا، ارے میرے بھی تعارف کی ضرورت ہے! کسی نے کہا، اب اتنے برے دن آگئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں قطعی امید نہیں تھی کہ ہم نے جس نیک نیتی سے اپنے قلمکاروں کو اسٹار ٹریٹمنٹ دینے کا فیصلہ کیا، اس کے عوض ہم کو اس طرح کے رویئے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بہر کیف قصہ تمام ہوا۔ گزشتہ ایک برس کے ماحصل کے طور پر ہمیں یہ بتاتے ہوئے بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ نیا دور کو جتنی تخلیقات اس عرصے میں موصول ہوئیں، ان میں بالخصوص افسانے کی بات کریں تو یہ بات جان کر ہماری حیرت انتہا تک پہنچ گئی کہ ان افسانہ نگاروں میں اسّی فیصد نئی نسل کی خواتین ہیں۔ ان افسانوں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب معیاری ہیں اور ان موضوعات پر لکھے گئے ہیں جو عام طور پر اردو ادب میں چھیڑے نہیں جاتے ہیں۔ اکثر محسوس کیا جاتا ہے کہ اردو کہانی میں نسوانی کردار اور خواتین کے پیچیدہ مسائل کمیاب ہیں۔ یہ بھی تقریباً تسلیم کیا جانے لگا تھا کہ اردو کی بیش بہا فکشن کی تانیثی روایت کو یہ نسل آگے نہیں بڑھا پا رہی ہے۔ اس کے برعکس ان خواتین کے حوصلہ کی داد دینا پڑے گی کہ ان لوگوں نے اتنی ہمت دکھائی۔ ان میں سے کچھ افسانوں کو پڑھ کر عصمت چغتائی کی یاد آئی تو کبھی واجدہ تبسم نظروں میں گھوم گئیں۔ قرۃ العین حیدر کے ڈکشن اور طرزِ تحریر کا عکس تو شاذ ہی نظر آیا لیکن رشید جہاں اور رضیہ سجاد ظہیر کی حوصلہ مندی ضرور نظر آئی۔ مسرور جہاں کے لہجہ کی بھی جھلک دکھائی دی اور کہیں کہیں پر کشور ناہید کی 'بری عورت' کی دھندلی سی تصویر بھی دکھی۔

نیادور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیادور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پابندی سے پوسٹ کئے جا رہے ہیں

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے جب اروندھتی رائے کو اتنی کم عمر میں ہی بکر جیسا عالمی اعزاز حاصل ہوا۔ ہندوستانی ادب کے لئے یہ بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اس کے بعد جھمپا لاہری، انیتا دیسائی، روپا باجوا، کرن دیسائی، لیما دھر، اندو مینن وغیرہ جیسی نئی قلمکاروں کا ایک سلسلہ چل پڑا اور ان سب نے بین الاقوامی سطح پر نہ صرف اپنی پہچان بنائی بلکہ عالمی پیمانے کے انعامات واعزازات بھی حاصل کئے۔ نینا ہریداس کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو حال ہی میں فرانس کی بہت بڑی میگزین کی ایڈیٹوریل ڈائرکٹر بنی ہیں۔ یہ وہی دور ہے جس میں ہم نے نادرہ ببر، شبانہ اعظمی، سعدیہ دہلوی، انجم حسن، زویا حسن، رانا ایوب، برکھا دتّ، افشاں انجم اور زویا اختر جیسوں کو ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کا آئیڈیل بنتے ہوئے دیکھا ہے۔

'نیا دور' کو حاصل ہونے والے خواتین کے افسانوں کو ہم نے اس پس منظر میں دیکھا اور محسوس کیا اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ 'نیا دور' کی طرح ہندوستان کے دوسرے اردو رسائل نے بھی نئی نسل کی خواتین کو اسی طرح شائع کرنے کی روش برقرار رکھی تو وہ دن دور نہیں جب ہم واپس اسی زریں عہد میں پہنچ جائیں گے جس نے رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی وغیرہ سے نوازا جن کے بغیر اردو فکشن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے گزشتہ ایک سال میں نئی نسل کے دو درجن سے زائد ایسے شعراء اور افسانہ نگاروں کو 'نیا دور' میں خصوصی تزئین کے ساتھ شائع کیا جن کی تخلیقات اس سے پہلے کسی بڑے رسالے میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ ہم ان خواتین کے افسانوں کے ساتھ تانیثی ادب کے ہمہ گیر پہلوؤں پر جلد ہی ایک خصوصی شمارہ شائع کریں گے۔

'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال information.up.nic.in پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

اردو ادب میں نکڑ ناٹک کی روایت

داؤد احمد
شعبۂ اردو گورنمنٹ گرلس پی۔جی۔کالج باندہ
موبائل: 8423961475

نکڑ ناٹک دور حاضر میں سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کا بہترین ذریعہ ہے۔نکڑ ناٹک کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ کر مسائل کو پیش کرتا ہے بلکہ یہ پیش کش کے دوران ناظرین کو بھی اپنے میں شامل کر لیتا ہے۔نکڑ ناٹک تماشائی اور اداکار کے درمیانی فاصلے کو اس حد تک کم کرتا ہوا چلتا ہے کہ اداکار ناٹک شروع ہونے سے پہلے کے تمام کام بھی ناظرین کے سامنے ہی انجام دیتے ہیں۔نکڑ ناٹک لوگوں کو جگانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اگر چہ سیاسی مقصد نکڑ ناٹک کی شرشت میں شامل ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ سماج کے دوسرے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہوا بھی چلتا ہے۔اس لئے آج نکڑ ناٹک سماج کو ایک نیا رخ عطا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔نکڑ ناٹک کی کوئی واضح تعریف ممکن نہیں،ہاں اس کی تعریف میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ'ایسا ناٹک جس کا کوئی مقرر کردہ اسٹیج نہ ہو، جو کہیں بھی کسی بھی وقت پیش کیا جا سکے جس کے تمام کردار سادہ لباس کا استعمال کریں جس میں Properties نہیں کے برابر ہوں،ساز و سامان صرف اتنا ہو کہ خود اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی لے جا سکیں،زبان عوامی ہو،موضوع عوام کے درمیان ہونے والے واقعات یا ان کی دشواریوں اور مسائل سے متعلق ہو اور بغیر کسی خرچ کے کھلے آسمان کے نیچے پیش کیا جا سکے اسے ہم نکڑ ناٹک کہہ سکتے ہیں۔

جدید نکڑ ناٹک کا آغاز احتجاجی پروپیگنڈہ (Agitational Propagandist) ناٹک سے ہوتا ہے۔نکڑ ناٹک کو عام طور پر سرکار مخالف سمجھا جاتا رہا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اس پر ظلم ڈھائے جاتے رہے ہیں، لیکن آج حالات بدل چکے ہیں اور اب حکومت بھی اکثر اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے اس کا سہارا لینے پر مجبور نظر آرہی ہے خواہ اسے خواندگی مہم کا پرچار کرنا ہو یا خاندانی منصوبہ بندی کا۔ نشیلی ادویات کے خلاف کچھ کہنا ہو یا جان لیوا بیماریوں سے بچنے کے طریقۂ کار کی بات ہو ہر چیز کی تشہیر نکڑ ناٹک کے ذریعے کی جا رہی ہے۔بعض نجی تجارتی اداروں نے بھی اپنی مصنوعات اور سامان کی تشہیر کے لئے نکڑ ناٹک کا سہارا لینا شروع کر دیا ہے۔

آج کے دور میں نکڑ ناٹک کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔اس کے مختلف اسباب و وجوہات ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ آج بجائے خود ناٹک میں لوگوں کو دلچسپی پہلے سے زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ نکڑ ناٹک میں اخراجات کم اور ساز و سامان بس برائے نام ہی ہوتا ہے اور تیسری سب سے اہم بات یہ کہ یہ ناٹک کسی بھی Performing Arts کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں پیش کیا جا رہا ہے۔نکڑ ناٹک کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہمیشہ issue based ہوتا ہے۔مثلاً آمد و رفت کے طور پر ٹرین یا بس کا کرایہ بڑھ گیا تو اس کی مخالفت میں نکڑ ناٹک کیا گیا،دیگر چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوا تو نکڑ ناٹک کے ذریعہ بے چینی کا اظہار کیا گیا وغیرہ۔نکڑ ناٹک کی اپنی انفرادی اہمیت ہے، بہت حد تک اسٹیج ڈرامے سے آگے بڑھ کر اس نے سماجی کام انجام دیا ہے۔نکڑ ناٹک نے ڈرامے کے فن کو گاؤں کے چوپال اور چھپروں تک پہنچا دیا ہے۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق نکڑ ناٹک ۱۹۱۸ء میں روس میں پیدا ہوا اور ہندوستان آنے سے پہلے ۱۹۲۰ء کے آس پاس چین کی کمیونسٹ پارٹی نے مزدوروں کو یکجا کرنے تحریک میں شامل کرنے کی غرض سے نکڑ ناٹک کا استعمال کیا۔اس طرح سماجی لڑائی میں چین کی فوج کے ساتھ ساتھ نکڑ ناٹک نے اہم کردار ادا کیا۔نہ صرف روس چین اور ویتنام بلکہ کوریا یوروپ کے ملکوں اور جنوبی ولاطینی امریکہ میں بھی نکڑ ناٹک عوامی آزادی کی تحریک میں پیش پیش رہا اور آج بھی انگلینڈ اور کینیا کی مزدور تحریک میں نکڑ ناٹک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ہندوستان میں نکڑ ناٹک کی شروعات ترقی پسند تحریک کی دین مانی جاتی ہے۔''اب تک یہی کہا جاتا رہا ہے کہ ممبئی میں IPTA نے پہلا نکڑ ناٹک پیش کیا۔یہ غلط ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ پہلے کوئی تحریک شروع ہوتی ہے بعد میں اس کو نام دیا جاتا ہے یا پھر بعد میں اسے کسی تنظیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں،اس لئے یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے نکڑ ناٹک پیش کئے گئے ہوں بعد میں (Indian Peoples Theatre Association) IPTA کے نام سے تنظیم منظر عام پر آئی ہو۔۱۹۴۳ء میں IPTA منظر عام پر آیا،اس لئے پہلے ممبئی میں نکڑ ناٹک پیش کئے جانے کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نہ تو سال پیشکش اور نہ ہی نکڑ ناٹک کا

نام معلوم ہوتا ہے'' (۱)۔نکڑ ناٹک کے کھیلے جانے اور اس کے آغاز سے متعلق مختلف الرائے ہیں پر یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ IPTA نے نکڑ ناٹک کو استحکام عطا کیا۔IPTA واحد ایسا گروپ ہے جو ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ کے ہر ضلع میں اپنی شاخ رکھتا ہے۔اپٹا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں نکڑ ناٹک کو اپناتے ہوئے اہم کردار ادا کیا، یہاں تک کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔

ہندوستان میں نکڑ ناٹک کا نام لیتے ہی صفدر ہاشمی کا نام فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔صفدر ہاشمی اس شخصیت کا نام ہے جس نے ہندوستان میں باضابطہ نکڑ ناٹک کی تحریک چلائی۔جس سے متاثر ہوکر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نکڑ ناٹک پیش کئے جانے لگے،نتیجہ یہ نکلا کہ ایسا شخص بھی ناٹک سے واقف ہوا جس نے ناٹک کا نام بھی نہیں سنا تھا۔یہ وہی شخص ہے جس نے جن ناٹک منچ (جنم) قائم کیا اور ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۹ء تک نکڑ ناٹک تحریک کی رہنمائی کی۔۱۹۷۸ء سے قبل صفدر ہاشمی نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں SFI کے پرچم تلے اور ایمرجنسی کے بعد اپنی ملازمت کے زمانہ میں نکڑ ناٹک پیش کئے تھے لیکن جن ناٹیہ منچ کے ذریعہ نکڑ ناٹک کر کے اسے ایک نیا رخ عطا کیا۔اب تک مکمل طور پر صرف سیاسی ناٹک ہی لکھے جارہے تھے اس کے برخلاف (جنم) نے سیاسی ناٹک کے ساتھ ساتھ سماجی ناٹک بھی لکھے۔صفدر ہاشمی نے پہلا نکڑ ناٹک کارخانہ مزدوروں پر مبنی ''مشین'' لکھا۔یہ ناٹک اکتوبر ۱۹۷۸ء میں پہلی بار پیش کیا گیا۔نکڑ ناٹک زیادہ تر موجودہ سماج میں رونما ہونے والے حادثات اور زندگی کے حالات پر مبنی ہیں۔

ہندوستان کے تمام صوبوں کے مختلف گروپ پر الگ الگ بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں پر ہر ضلع میں نکڑ ناٹک گروپ نہ ہوں اور یہ گروپ لگاتار نکڑ ناٹک نہ پیش کر رہا ہو۔موجودہ دور میں ہر شہر میں کئی کئی نکڑ ناٹک گروپ ہیں جو عوامی روایت کو مدنظر رکھ کر نکڑ ناٹک پیش کر رہے ہیں۔موجودہ دور میں نکڑ ناٹک نے عوام پر اس قدر اثر ڈالا ہے کہ جب کوئی شخص کوئی بات عوام تک پہنچانا چاہتا ہے تو وہ نکڑ ناٹک کا سہارا لیتا ہے یعنی نکڑ ناٹک ایک زبردست میڈیم کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔نکڑ ناٹک پر یہ الزام تھا کہ یہ حکومت کے خلاف کام کرتا ہے لیکن اب تو حکومت نے بھی نکڑ ناٹک کو گود لے لیا ہے۔حکومت اس کا سہارا لینے پر مجبور نظر آتی ہے کیوں کہ اسے خواندگی، خاندانی منصوبہ بندی، ٹیکہ لگانے کی مہم، منشیات کے خلاف، جان لیوا بیماریوں سے بچنے کے طریقے وغیرہ کا پرچار نکڑ ناٹک کے ذریعہ کرنا پڑ رہا ہے۔نکڑ ناٹک صرف عوام کے لئے اہم نہیں رہ گیا بلکہ حکومت کے لئے بھی کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔نکڑ ناٹک کسی خاص موضوع پر نہ ہو کر سماج کا سیاسی ترجمان ہوتا ہے۔نکڑ ناٹک فنکاری کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔اداکاری کے معاملے میں جسموں کے حرکات و سکنات کا خوب استعمال کیا جا رہا ہے۔جہاں تک موضوع کی بات ہے، نکڑ ناٹک ہمارے موجودہ سماجی مسائل کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے موضوعات کو بھی لیا جاتا ہے جو بہت دنوں تک Relevant رہ سکیں۔

نکڑ ناٹک پر غور کریں تو یہ بریخت (Brecht) کے نظریے پر پورا اترتا ہے۔جس مقصد کے تحت نکڑ ناٹک کا وجود عمل میں آیا تقریباً وہی مقصد بریخت کے ''ایپک تھیٹر'' کا تھا۔اس لئے نکڑ ناٹک ٹھیک ان تھیٹروں کی طرح ایک ایسی تحریک کی وجہ سے زندہ رہ سکتا ہے جو زندگی کے پیچیدہ مسائل سے جڑے سوالوں کو عوام کے بیچ میں اٹھا کر ان کا حل تلاش کرنے میں ان کی مدد کرے ،اس کے لئے ضروری ہے کہ جب ہم نکڑ ناٹک پیش کریں تو اس کی زبان نہایت آسان ہو۔جس علاقہ کو دھیان میں رکھ کر ناٹک تیار کریں اس علاقے کی بولی میں ڈھلی زبان ہو۔ناٹک کی کہانی اور روپ میں اتنی لچک ہو کہ وہ مختلف علاقائی بولیوں، زبانوں اور ان کے لوک روپوں میں ڈھل سکے۔اس میں عام بول چال کے محاورے کا استعمال ہو، ناٹک المیہ ہونے کے بجائے مزاحیہ طرز پر دل کو چھوٹنے والا ہو۔لوگوں کو باندھے رکھنے کے لئے جس علاقہ میں ناٹک پیش کر رہے ہوں، ناٹک وہاں کی لوک روایت پر مبنی ہو۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں زیادہ تام جھام ہونے کے بجائے سادہ ہو، زیادہ خرچیلے سازو سامان اور تڑک بھڑک والے لباس وغیرہ کا استعمال نہ ہو، ناٹک لوگوں کو اندھیرے میں نہ چھوڑتا ہو بلکہ کسی راستے کی جانب اشارہ کرتا ہو، ضرورت پڑنے پر صاف صاف کہتا بھی ہو۔

۱۹۸۹ء میں نکڑ ناٹک کی قدآور شخصیت صفدر ہاشمی کو نکڑ ناٹک ''ہلہ بول'' پیش کرتے ہوئے اتر پردیش کے صاحب آباد ضلع کے جھنڈا پور گاؤں میں گولی کا نشانہ بنایا گیا جس کی تاب نہ لاکر دوسرے دن ہی وہ دہلی کے ایک اسپتال میں جاں بحق ہوگئے۔اس حادثہ سے نکڑ ناٹک کے فنکار اس قدر متاثر ہوئے کہ ان لوگوں نے صفدر ہاشمی کو موضوع بنا کر کل بیالیس نکڑ ناٹک لکھے اور انھیں گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں پیش کیا۔صفدر ہاشمی سے متعلق زیادہ تر ناٹک بنگلہ زبان میں لکھے گئے۔اس کے علاوہ ہندی، اردو، اسمی، منی پوری میں بھی اس سانحہ پر پرزور ردعمل کا اظہار کیا گیا۔اردو میں کمال احمد نے ''وہ زندہ ہے'' کے عنوان سے صفدر ہاشمی کے قتل کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے ایک نکڑ ناٹک لکھا۔صفدر ہاشمی کے نکڑ ناٹکوں میں ''راجا کا باجا'' ''عورت'' اور ''اپہرن بھائی چارے کا'' وغیرہ ہیں۔ان کی یوم پیدائش یعنی ۱۲/اپریل ہندوستان کے ہر حصے میں ''نکڑ ناٹک دیوس'' کے روپ میں منایا جاتا ہے۔پورے ملک میں اس دن نکڑ ناٹک پر سیمینار، نکڑ ناٹک فیسٹیول یا پھر نکڑ ناٹک مقابلہ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

''اردو نکڑ ناٹک کی ابتداء کے سلسلے میں فی الحال وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں ناٹک اردو کا پہلا نکڑ ناٹک ہے جو فلاں سال پیش کیا گیا کیوں کہ اس میں ابھی اختلاف ہے۔اور ایسا کوئی مکمل ثبوت حاصل نہیں ہو سکا ہے جس کی بنیاد پر کسی بھی ایک ناٹک کو اردو کا پہلا ناٹک قرار دیا جا سکے۔لیکن اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اب تک پیش کئے گئے نکڑ ناٹکوں میں ظہیر انور کا ''بلیک سنڈے'' پہلا ایسا ناٹک ہے جو کسی بھی زبان کے نکڑ ناٹک کے مقابلے میں کسی بھی زاویے سے کمتر نہیں ہے۔''(مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک۔ڈاکٹر محمد کاظم،صفحہ ۱۰۳۔۱۰۴)اردو نکڑ ناٹک نے نویں دہائی کی شروعات میں نئی کروٹ لی۔اس کی خاص وجہ اول تو یہ نظر آتی ہے کہ ۱۹۸۹ء میں صفدر ہاشمی کا قتل ہوا۔انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے نکڑ ناٹک سے بہتر دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ صفدر ہاشمی نکڑ ناٹک کے ایک بڑے فنکار تھے جنھوں نے ہندوستان میں نکڑ ناٹک کو نئی جہت عطا کی۔انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کمال احمد نے ناٹک ''وہ زندہ ہے'' لکھا۔ناٹک ''وہ زندہ ہے'' صفدر ہاشمی کی اس زندگی پر مبنی ہے جس کے درمیان انہوں نے مزدوروں کو ان کا حق دلانے کے لئے ناٹک کو ہتھیار بنایا۔ناٹک کرتے وقت ہی صاحب آباد میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس کی وجہ سے وہ ۲ر جنوری ۱۹۸۹ء کو اسپتال میں اس دنیا سے چل بسے۔نویں دہائی کی شروع سے ہی ملک میں فرقہ پرست قوتوں نے امن کے ماحول کو تباہ و برباد کرنا شروع کیا جس کی مثال ہمیں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو دیکھنے کو ملی اور پھر اس کے بعد ملک گیر پیمانے پر ہوئے فسادات اور انسانیت کے قتل و غارت گری سے ملک کی دھرتی سرخ ہوتی نظر آئی۔ایسے حالات میں ایک حساس فنکار کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔نتیجے کے طور پر ظہیر انور نے ''بلیک سنڈے'' اور کمال احمد نے ''۶ر دسمبر'' ناٹک لکھے جو انھیں واقعات پر مبنی ہیں۔

ملک میں بندھوا مزدوری خصوصاً بچہ مزدوری ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر گئی ہے،کوئی بھی دوکان،مکان کارخانہ یا دفتر ایسا نہیں ملے گا جہاں بچے مزدوری نہ کرتے ہوں۔ان بچوں سے کام تو ضرورت سے زیادہ لیتے ہیں پر انھیں مزدوری برائے نام دی جاتی ہے۔جو عمر ان بچوں کے علم حاصل کرنے کی ہوتی ہے اس میں مزدوری کرنی پڑتی ہے۔چھوٹی سی عمر میں کتابوں کے بجائے بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔بچوں کی مزدوری کے خلاف ملک گیر سطح پر تحریک چل رہی ہے۔اس تحریک میں اردو نکڑ ناٹک نے بھی حصہ لیا ہے۔کمال احمد نے ناٹک ''بند مٹھی کے کھلنے تک'' لکھا۔جو بچوں کی مزدوری کی مختلف نوعیت کو منظر عام پر لاتا ہے۔غرض اگر ہم یہ کہیں کہ ملک گیر سطح پر ہو یا صوبائی سطح پر،کسی بھی طرح کے مسئلے سے ہمیں دو چار ہونا پڑا،ہم نے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اردو نکڑ ناٹک پیش پیش رہا ہے۔مختلف ناٹک کاروں نے مختلف موضوعات پر نکڑ ناٹک لکھ کر اپنی خدمات انجام دی ہیں۔اردو میں لکھے گئے نکڑ ناٹکوں میں فساد کے موضوع پر ''بلیک سنڈے'' اور'' ۶ر دسمبر'' خواندگی کے مسئلے پر ''صبح کا بھولا،جنگل میں اسکول،چہرے اور قلم اور ہم'' سامراجیت کے ردعمل کے طور پر'' آسمان چپ ہے'' مزدوروں کے استحصال پر'' وہ زندہ ہے'' اور'' جڑ کاٹنے والے'' منشیات جیسی زہر آلود اشیا کو موضوع بنا کر'' زندگی زندگی'' بدعنوانیوں پر مبنی ''حوالہ جاترا'' وغیرہ جیسے کامیاب نکڑ ناٹک اہم ہیں۔

اردو نکڑ ناٹک کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد اگر مجموعی طور پر اسے دیکھیں تو ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نکڑ ناٹک میں جتنی بھی تکنیک استعمال کی گئی ہے ان تمام کو اردو نکڑ ناٹک میں بخوبی بروئے کار لایا گیا ہے۔موضوعات کے اعتبار سے دیکھیں تو اردو نکڑ ناٹک میں کمی کا احساس ہرگز نہیں ہوتا۔زبان کے اعتبار سے دیکھیں تو اردو نکڑ ناٹک کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔مشرقی ہند کا اردو نکڑ ناٹک زبان کے معاملے میں دوسری زبان کے ناٹکوں سے پچھڑا ہوا ہے۔properties کے استعمال کے معاملے میں اردو نکڑ ناٹک نے اچھی شروعات کی ہے۔اول تو مکھوٹا کا استعمال کیا ہے۔مکالمے کے اعتبار سے اردو نکڑ ناٹک دوسری زبانوں میں پیش کئے گئے ناٹکوں سے کسی بھی حد تک کم نہیں ہے۔کم سے کم الفاظ میں چھوٹے چھوٹے چبھتے ہوئے مکالمے مل جاتے ہیں۔پیش کش کے لحاظ سے اردو نکڑ ناٹک دوسری زبانوں کے ناٹکوں سے پچھڑا ہوا ہے کیوں کہ اول تو اردو نکڑ ناٹک بہت کم تعداد میں لکھے جا رہے ہیں اور دوئم جو لکھے جا رہے ہیں ان میں سے چند ناٹک یا تو اخبار یا رسائل کی زینت بن کر رہ گئے ہیں یا پھر ناٹک کار کی فائل میں پڑے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو اردو نکڑ ناٹک کا سفر مختصر تو ضرور ہے لیکن مایوس کن نہیں۔اپنے اس مختصر سے سفر میں بتدریج ارتقاء پذیر ہے۔شروع شروع میں اردو میں اس کا رواج نہیں کے برابر نظر آتا ہے لیکن ۱۹۹۰ء کے بعد سے اردو میں لگاتار کامیاب نکڑ ناٹک لکھے جا رہے ہیں۔لیکن پیش کش کے اعتبار سے دوسری زبانوں کے مقابلے میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔کسی بھی ناٹک کے لئے یہ بڑی افسوس ناک بات ہوتی ہے کہ وہ اخبار و رسائل کے صفحات کی زینت بن کر رہ جائے۔ناٹک تو پیش کرنے کا فن ہے۔اس لیے یہ فن اس وقت تک نامکمل ہے جب تک کہ وہ عوام کے درمیان پیش نہ کر دیا جائے تا کہ عوام کی بات عوام تک بہ آسانی پہنچ سکے۔

ماخذ:

۱۔ مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک،مصنف ڈاکٹر محمد کاظم

۲۔ اردو ڈراما۔تاریخ و تنقید از ڈاکٹر عشرت رحمانی

۳۔ اردو ڈراما روایت اور تجربہ از ڈاکٹر عطیہ نشاط

□□□

آغا حشر کاشمیری ملقّب بہ انڈین شیکسپیئر

عظیم ڈرامہ نگار، اداکار اور شاعر

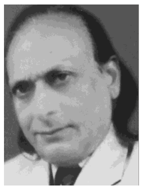

زین الدین حیدر

بیکن گنج، کانپور

موبائل: 9305628965

اردو ڈرامہ کا ذکر جب بھی چلتا ہے، آغا حشر کاشمیری کا خیال ذہن میں فوراًا بھرتا ہےاورڈرامہ پر جب کوئی تذکرہ، تبصرہ یا مباحثہ وجود میں آتا ہےتو آغا صاحب کا نام فی الفور زبان پر آجاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو ڈرامے کی بات اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک پارسی تھیئٹر کا ذکر نہ کیا جائے اور پارسی تھیئٹر کا ذکر اس وقت تک نامکمل ہے جب تک آغا حشر کاشمیری کا ذکر نہ کیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا صاحب نے ڈرامے تجارتی مقاصد کے لئے لکھے اور تجارتی مقاصد سے لکھے جانے والے ڈراموں کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔آغا صاحب کے سارے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھے گئے اور اسٹیج کے ڈراموں کے کچھ مسلمہ اصول وضوابط تھے اور سب سے اہم اوقات کی پابندی کا لحاظ اور اس کی حد بندی ہے۔ ڈرامہ نگار کو ان میں مقید ہوکر رہنا پڑتا ہے، اس میں آزادیٔ اظہار کے موقع بار بارنہیں مل پاتے۔ ہمہ وقت عوام، ناظرین وتماشہ بینوں پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ان کے ذوق وشوق کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے چاہے وہ بلند ہو یا پست۔ بہرحال ان کو وہی دیا جاتا ہے جس کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک بلند فنکار اپنے ذاتی اظہار خیال کے لئے مواقع فراہم کراتا ہے اور اپنی ذاتی وشخص پسند و ناپسند اصول و بے اصولی کے اظہار کے لئے چند کرداروں یا کسی ایک کردار کی تخلیق کر کے اپنا مطلب ادا کر لیتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کسی فن پارے میں فنکار کی شخصیت کا ابھر کر سامنے آنا ضروری ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر فنکار کی ذات وشخصیت پورے طور پر ابھر کر سامنے نہ بھی آئے تو کم ازکم اس کے دھندلے نقوش کا آنا انتہائی ضروری ہے اور یہ چیز ڈرامے میں مفقود ہے بلکہ کسی حد تک یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ڈرامے میں فنکار کی شخصیت کو ابھر کر سامنے آنے کا موقع نہیں ملتا۔ ایک طرف اس کی توجہ اس کے ناظرین وتماشہ بینوں کی طرف ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کی توجہ اس کے کرداروں اور ان کی شخصیت، مراتب اور مکالموں کے ارتقاء کی جانب مبذول رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کیفیت میں اس کی ذات و کیفیت کھوکر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح ڈرامے میں کسی نظریات و پیغام کی پیشکش کی بھی گنجائش کم ہوتی ہے مگر ایسا سوچنا اور کہنا صحیح نہیں ہے۔ بڑے ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا اہے کہ دوسرے فنون لطیفہ کے فنکاروں کی طرح ڈرامہ نگار بھی اپنے تخلیق کئے ہوئے کرداروں کے ذریعہ اپنے نظریہ کی اشاعت بھی کر لیتا ہے اور اپنے افکار و خیالات کا اظہار بھی۔ کسی ڈرامہ نگار کی تخلیق کو لے کر باریک بینی سے مواخذہ کیا جائے اور کرداروں کا تجسس کیا جائے تو ان میں یقینا کوئی ایک کردار ڈرامہ نگار کا اپنا ذاتی نمائندہ ضرور ملے گا۔ یہ بات آغا حشر کے ڈراموں میں بھی جا بجا ملتی ہے۔

اردو ڈرامہ کے اسٹیج کرنے کی باضابطہ کوشش انیسویں صدی کے اواخر میں نظر آتی ہے۔ جب تجارتی نقطۂ نظر سے مختلف ناٹک کمپنیوں نے جنہیں پارسی تھیئٹر کا نام دیا جاتا ہے، اپنا کام شروع کیا۔ ان کمپنیوں پر انگریزی اسٹیج کا بھرپور اثر تھا مگر انہیں تماشہ بینوں کی پسند اور ضرورت کے لحاظ سے ہندوستانی ماحول میں پیش کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔ اسی ماحول میں نئے ڈرامے لکھے جانے لگے جنہیں صحیح معنوں میں اردو تھیئٹر کہہ کر پکارا جاسکتا ہے اور یہی اردو تھیئٹر درحقیقت عوامی اسٹیج کہے جانے کے مستحق تھا۔

جن لوگوں نے عوامی اسٹیج کی یہ ضرورت پوری کی ان میں طالب بنارسی، احسن لکھنوی، پنڈت نرائن پرشاد بیتاب، سید مہدی حسن اور آرام کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں بیشتر نے انگریزی ڈراموں کے ترجمے یا چربے پر مبنی ناٹک پیش کئے۔ آغا حشر کاشمیری نے اسی دور میں یہی کچھ کام بہتر اور نمایاں فرق کے ساتھ کیا۔ ترجموں کے علاوہ انہوں نے طبع زاد تخلیقات بھی عوام کے سامنے پیش کیں اور وہ اس بلند فنکارانہ انداز و چابکدستی سے کہ انہیں اردو تھیئٹر یا عوامی اسٹیج کا میر کارواں کہنا بالکل مناسب ہوگا۔

دنیا کی مختلف زبانوں کے ڈرامہ نگاروں میں یہ بات مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ سبھی ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے اور ایسا لگتا ہے کہ ڈرامہ نگاری اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں کچھ اعلیٰ درجے کے

شاعر اور کمتر درجے کے ڈرامہ نگار تھے تو کچھ اعلیٰ درجے کے ڈرامہ نگار اور کمتر درجے کے شاعر مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ ڈرامہ نگاری اور شاعری کی خوبیاں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کالی داس، بھوبھوتی، شودرک، سوفوکلیز، یوری پیڈیز، شیکسپیئر، مارلو ابسن، بن جانسن، ملٹن، براؤننگ، برنارڈ شا، گالس وردی، ٹی ایس ایلیٹ، رابندر ناتھ ٹیگور، امانت، بھارتیندو ہرشچندر، جے شنکر پرساد، بیتاب، طالب، احسن اور آغا حشر یہ سب ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ آغا حشر ایک انتہائی خوش فکر شاعر تھے۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ شاعری میں عشقیہ مضامین، تغزل، زبان و محاورے نیز صنائع و بدائع کے حسن پر خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس میں کلام نہیں کہ غزلیہ شاعری اپنے عروج پر تھی۔ آغا حشر جب بنارس میں تھے تو وہیں تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے تھے اور استاد فائز دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔

آغا حشر کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور ان کی شاعرانہ کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ آغا حشر کی ڈرامائی شاعری اور دوسرا حصہ آغا حشر کے ہندی گیت و نظمیں اور تیسرا حصہ آغا حشر کی غزلیہ شاعری۔ آغا حشر کی ڈرامائی شاعری کے ضمن میں ہم ان کے ڈراموں میں کرداروں کی زبان سے کئے گئے کسی خصوصی موضوع کی وضاحت یا تاثر قائم کرنے کے لئے ان اشعار کا جائزہ لے رہے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ آغا حشر میں ملکۂ شاعری فطری تھا اور وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ ابھرے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں
نہ کر برباد اپنی زندگی بوتل کے دیوانے
وہ کاٹے گا بڑھاپے میں جو بوئے گا جوانی میں
یہ دارو کا پیالہ موت کا کڑوا پیالہ ہے
ملا ہے زہر شربت میں چھپی ہے آگ پانی میں

ڈرامہ رستم و سہراب میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دنیائے بے ثبات میں ہر شئے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے ہر صبح کی ہے شام

رستم اپنی شجاعت اور دلیری کا بیان رجز میں یوں کرتا ہے:

زمیں کنیز ہے میری فلک غلام مرا
اجل کی طرح ہے بے رحم انتقام مرا
زمانہ جس سے لرزتا ہے میں وہ رستم ہوں
نہیں سنا ہو تو اب سن لو مجھ سے نام مرا

آغا حشر کا ایک ناٹک 'عشق و فرض' ہے جس کی زمین بھی ایران و توران کے درمیان جنگ کے موضوع اور آزادی و غلامی کی کشمکش پر تیار کی گئی ہے:

مردود ہے وہ کوشش ملعون ہے وہ خامہ
آزادیٔ وطن کا لکھے جو بیع نامہ
غیر سمجھ رہے ہو غیروں کی بندگی میں
مر جاؤ گر ہے جینا ذلت کی زندگی میں

آغا صاحب نے اپنی ڈرامائی شاعری میں بیشتر مسدس مکالمے ترتیب دئے ہیں اور انہیں بحور و اوزان کا استعمال کیا ہے جن میں رجزیہ پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آغا حشر کے ڈراموں سے کچھ متفرق اشعار پیش ہیں جو آغا حشر کے قادر الکلام اور انتہائی خوش فکر شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔

عشق وفرض

مجروح شوق جور کش روزگار ہوں
زخمی جگر کا شوق وفا کی پکار ہوں
دل کو نشہ ہے عشق کا آنکھوں کا دید کا
سہراب اب ہے غلام ہے گرد آفرید کا
زندہ ہے تجھ سے کیف طرب کائنات میں
آسودگی روح نشاطِ نظر نہیں
دنیا میں کچھ نہیں ہے محبت اگر نہیں

سلور کنگ

تسکین پائے دل خبر ایسی شتاب دو
ان سب کا ایک لفظ میں مجھ کو جواب دو

عشق وفرض

نہیں معلوم رازِ مرگ دنیا کے طبیبوں کو
اگر فرصت ملے تو یاد کرنا بدنصیبوں کو

آغا حشر کاشمیری کی شاعری کے دوسرے حصے میں ہم ان کے لکھے ہوئے ہندی گیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کو ہندی زبان پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اپنے ناٹکوں کے لئے انہوں نے جو بھجن، گیت اور چھند رچے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے ہندی کلام کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں:

سلور کنگ:

برہن کے گھر چھائی بدریا برست ہے گھنگور
پاپی پپیہرا پیو نہیں آئے کاہے مچائے شور

بھگت سورداس

سانورا بنسی والا نند لالا متوالا
ہاں گوکل کا اجیالا
کرشن کرشن کر سانجھ سکارے
کرشن نام سب کا دکھ ٹارے
پار لگانے والا نرالا متوالا
ہاں گوکل کا اجیالا
کوئی کیت لئے کرشن مراری
کوئی کیت لئے شیام بہاری
کوئی کہے نٹور گردھاری
ہاں گوکل کا اجیالا

آغا حشر کاشمیری کی شاعری کے تیسرے حصے میں ہم ان کی غزلیہ شاعری پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آغا صاحب کی طبیعت رومانی اور مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا جو

بقول شخصے اچھی غزل گوئی کے لوازم میں ہیں۔ پھر وہ دور جس میں آغا حشر نے شاعری کی، داغ دہلوی کا دور تھا جو ایک طرح سے اردو غزل کے شباب کا زمانہ کہا جاسکتا ہے اور محبوب سے گفتگو شاعری کا ماحصل قرار دی جاتی تھی۔ غزلوں میں چلبلا پن، معاملہ بندی، رعایات لفظی و معنوی، محاورات اور روزمرہ کے اشعار میں غزل گوئی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

آغا حشر کی غزلوں میں بھی اس کی چھاپ ملتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تقاضائے وقت سے دامن بچانا بہت مشکل ہوتا ہے پھر طبیعت و مزاج کی ساخت بھی ماحول اور زمانہ کے رہین منت ہے۔ خیر معاملہ جو بھی ہو مگر ہم کو آغا حشر کاشمیری اپنی غزلوں میں ایک بہت عظیم المرتبت غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملتے ہیں:

محبت کا فسانہ کہہ رہا ہے ایک اک آنسو
نہ جانے کب سنی آنکھوں نے دل کی داستاں تم سے

....

کتنی گھٹائیں آئیں برس کے نکل گئیں
آنسو مگر مرے نہ تھمے تم سے چھوٹ کے

......

ڈر ہے کہیں چھین نہ لے ذوق طلب بھی
ہمت کی دعا کوشش ناکام دئے جا

آغا حشر کی بیشتر غزلیں بڑی مترنم اور مرصع ہیں کہ سنتے ہی منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جاتی ہے۔

آباد تیری یاد سے جو تھا دیارِ عشق
برباد ہے تباہیٔ اہل وفا کے بعد
لب سی دئے ہیں خوف شکست امید نے
کس سے کریں گے تیرا گلہ پھر خدا کے بعد
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

......

تم اور فریب کھاؤ بیانِ رقیب سے
تم سے تو کم گلہ ہے زیادہ نصیب سے
گویا تمہاری یاد میں میرا علاج ہے
رہتا ہے پہروں ذکر تمہارا طبیب سے
دھندلا چلی نگاہ، دمِ واپسیں ہے اب
آ پاس آکے دیکھ تو مجھ کو قریب سے

آغا حشر ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ تھیٹر کے مالک، منیجر، ہدایت کار اور اداکار بھی تھے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں کی ہدایت بھی دی اور ان میں اداکاری بھی کی۔

اس ضمن میں ان کی مماثلت انگریزی کے عظیم ڈرامہ نگار اور شاعر ولیم شیکسپیئر سے ہو بہو نظر آتی ہے۔ شیکسپیئر نے ڈرامے لکھے، انہیں اسٹیج کیا اور ان میں اداکاری بھی کی۔

جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنی ایک فلم کمپنی بنائی۔ دوسرے لوگوں کے لئے فلم کی اسکرپٹ لکھی اور ان میں اداکاری بھی کی۔ ان کو عوام اور اسکالرس نے انڈین شیکسپیئر کے لقب سے نوازا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آغا صاحب اس کے مستحق تھے۔

❑❑❑

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ اول)

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر **پروفیسر مشیر الحسن** کا مقالہ

اردو کے مشہور و معروف شاعر **انور جلالپوری** کی شخصیت اور فن پر **وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، منور رانا، افتخار امام صدیقی، مولانا عبدالعلی فاروقی، خوشبیر سنگھ شاد، سنجے مصرا شوق، شفیع جاوید، احتشام افسر، شہریار** وغیرہ کے مضامین اور **بھگوت گیتا** کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

اب جولائی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

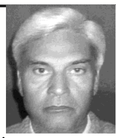

راشد جمال فاروقی
C-6، گلی نمبر ۳، شاہین باغ، نئی دہلی
موبائل: 9891552044

خبروں کے نرغے میں

باخبر، باعلم رہنے کا جنوں
کن حدوں تک جا چکا ہے
ہر گھڑی ہر آن بس
خبروں کے حملے بڑھ رہے ہیں
واقعہ یا حادثہ یا سانحہ، جو کچھ بھی ہے
وہ آپ کے پردے پہ آویزاں ہے
اپنی پوری ہیئت ناک صورت میں
ابھی تو آپ، پچھلے حادثوں پر ہی یقین کرنے کی تیاری میں تھے
یہ کیا؟
تحیر کا نیا سیلاب در آیا
تجسس کے نئے ریلے امنڈ آئے
اگر اقدار کے کچے گھروندے بہہ بھی جائیں تو تعجب کیا
یقیں کی سب فصیلیں کانپ کر گر جائیں ایسے زلزلے میں
تو بھی کم ہے
پھٹی آنکھوں سے یہ دلدوز منظر دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں میں
متاعِ اعتبار آدمیت لٹ رہی ہے
جو اک مانوس دنیا تھی وہ پیچھے چھوٹ رہی ہے

ایک بیمار صبح

اگر معذور ہو چستی سے پُر لوگوں کو دیکھو
اندھیرے منھ، وہ اک اخبار والا
گزشتہ روز کی سب لعنتوں کو رول کر کے
تمہارے بند دروازے پہ، کب کا پھینک کر
جا بھی چکا ہے
تمہارا دودھ والا
شیر خواروں کی صبح ہونے سے پہلے
دودھ رکھ کر جا چکا ہے
اگر معذور ہو، کھڑکی کے شیشوں سے چپک کر بیٹھ جاؤ
اور دیکھو
کہ یہ اسکول جاتے حور و غلماں
کتنے بھاری بیگ تھامے، ہنستے گاتے جا رہے ہیں
ان کے سر کے ٹھیک اوپر، چہچہاتے غول چڑیوں کے
تلاش رزق میں جاتے ہوئے دیکھو
اگر معذور ہو، شامل نہیں ہو گہما گہمی میں
تو کیا!
کھڑکی کے شیشوں سے چپک کر بیٹھ جاؤ

لَاتَقنَطُوا

سنا ہے کہ کچھ لوگ خنداں بھی ہیں
بات کیا ہے
کہ جشن طرب سے پرے
چند چہروں سے آزردگی ہے عیاں
چند مسلے ہوئے پھول ہیں درمیاں
آسماں بھی اداسی کی چادر لئے
چاند، سورج، دھواں
جانے کیا بات ہے
جو تونگر ہیں وہ مضطرب ہیں بہت
جو تہی دست ہیں
وہ بھی مغموم ہیں؟
کیا تمول کا رشتہ ہے احساس سے؟
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے؟
کچھ بھی کھلتا نہیں
سنگ باری میں مصروف ہیں رات دن
پیر و جواں
اسی انبوہ میں
میں بھی مصروف ہوں
اور پھر یہ ہوا! اک نئی صبح امید کی آگئی
ایک خوشبو بھرا مست جھونکا ہوا کا یہاں آگیا
جیسے دستِ صبا
جیسے حرفِ دعا
اور امید کے پھول کھلنے لگے
سارے گریہ کناں لوگ ہنسنے لگے

عالیہ خان
ڈی- ۱۳لین نمبر ۱، نورالٰہی نارتھ گھونڈہ
موبائل: 7503090927

عورت کو بولنے دو

لفظ سے لفظ کا رشتہ ہی عجب رشتہ ہے
بات سے بات نکلتی ہی چلی جاتی ہے
اس پہ لوگوں کا یہ الزام
کہ میں بات بہت کرتی ہوں
چونکہ میں عورت ہوں
میرے الزام تراشوں سے
یہ پوچھے کوئی
زہر کیا یوں بھی پیا جاتا ہے؟
اپنے لب اپنی زباں سی کے جیا جاتا ہے؟
جانے کیسی یہ میرے عہد کی مجبوری ہے؟
صرف مردوں کو ہی اظہار کی آزادی ہے
عورتیں سارا الم سہتی ہیں
اور چپ رہتی ہیں
لوگ مردوں کی کہانی تو لکھا کرتے ہیں
کیوں یہ عورت کی کہانی نہیں لکھتا کوئی
کیوں چمکتا نہیں احساس کا سورج آخر
کیوں خموشی کی چٹانوں سے
پگھلتی نہیں یہ بے حس برف
آیئے ایسی روایت کا کریں ہم آغاز
توڑ دیں چپ کا پہاڑ
عورتیں مردوں کو
اور مرد بھی سب عورتوں کو بولنے دیں
دل کی الجھی ہوئی ہر ایک گرہ کھولنے دیں

بشریٰ صدیقی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی
موبائل: 9208168898

نارد نے کہا

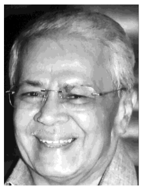

سلام بن رزّاق

B-603، نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ) ممبئی

موبائل: 9967330204

اور پھر نارد نے والیا سے پوچھا

''تو یہ کُکرم کس کے لیے کرتا ہے؟''

والیا نے نیزے کو اپنے ہاتھوں پر تولتے ہوئے جواب دیا۔

''اپنے بیوی بچّوں کے لیے''

نارد مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسے، والیا انھیں سُرخ آنکھوں سے گھورتا ہوا بولا۔

کیوں؟ تو کیوں ہنستا ہے''

''تیری مورکھتا پر''

والیا نے نیزہ فضا میں بلند کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

''بتا کیوں ہنسا، ورنہ بیندھ کر رکھ دوں گا۔''

نارد اسی پُرسکون انداز میں بولے۔

''سچ میں تیری مورکھتا پر ہنس رہا ہوں، کیوں کہ تیرے چاروں طرف گھور اندھکار پھیلا ہے۔ اور تو نہیں جانتا کہ تجھے کدھر جانا ہے، تو جن لوگوں کے لیے یہ کُکرم کر رہا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے سوارتھ کے لیے تجھ سے بندھے ہوئے ہیں۔ جب تجھ سے ان پاپوں کا حساب مانگا جائے گا، اس وقت نہ تیری بیوی تیرے کام آئے گی نہ تیرے بچّے۔''

''ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اُن کے سُکھ اور آرام کے لیے کر رہا ہوں، جب اس کا بھگتان ہوگا وہ سب میرے ساتھ ہوں گے۔''

''جا! جا کر اپنی بیوی بچّوں سے پوچھ کر آ کہ وہ لوگ تیرے کرموں کے ساجھی دار ہیں یا نہیں۔''

والیا اپنی گپھا میں لوٹ گیا، بیوی، بچّے اور دوسرے گھر والوں سے باری باری پوچھا کہ کیا وہ لوگ اس کے کرموں کے ساجھی دار ہیں؟''

جیسا کہ رامائن میں آگے لکھا ہے۔ وہ سبھی لوگ نفی میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''تیرے کرم تیرے ساتھ، ہم تو کیوَل تیرے دھن، سادھن کے بھوگتا ہیں۔''

والیا یہ جواب سُن کر کانپ جاتا ہے۔ اور یہ کہانی پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی کانپ گیا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اور دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔ جانے اس چھوٹی سی کتھا میں ایسا کیا تھا کہ یک بیک وہ بے حد مضطرب ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر ایک نظر اپنے ارد گرد ڈالی۔ اسے لگا وہ اپنے فلیٹ کے ڈرائینگ روم میں نہیں ہزاروں برس سے بندھیا گری کے گھنے جنگل میں کھڑا ہے۔ اور ایک غیبی آواز اس کے چاروں طرف ہواؤں کے دوش پر سرسراتی پھر رہی ہے۔

''کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟''

''کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟''

اور پھر ...... جیسے سیکڑوں چڑیلیں ایک ساتھ چنگھاڑتی ہیں۔

''نہیں..........نہیں..........نہیں''

کمرے میں رکھے ٹی وی سیٹ سے نارد کا چہرہ جھانکتا ہے۔ گلے میں تنبورا لٹکائے منجیرا بجاتے نارد کی آواز آتی ہے۔

'' نا......را ......ئن...... نا......را......ئن، کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟''

دیوار پر ٹنگی اٹالین گھڑی کا پنڈولم ہلتا ہے۔

''نہیں......نہیں......نہیں......نہیں......''

قیمتی وارڈ روب ڈائننگ ٹیبل، کرسیاں، فرج، ایکویریم، بلجیم گلاس کا شوکیس، ٹی وی سیٹ، چھت میں لٹکتا آرائش شمع دان، دیواریں، کھڑکیاں، کھڑکیوں میں لٹکتے ریشمی پردے، غرض کمرہ، کمرے کی ہر چیز اس سے بس ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی۔

''کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟''

اور دیوار پر ٹنگی گھڑی کا پنڈولم متواتر ایک ہی لے میں ہِل رہا تھا۔

''نہیں......نہیں......نہیں......نہیں......''

اس نے پیشانی کا پسینہ پونچھا، رامائن کو بند کر کے میز پر ایک طرف رکھ دیا۔ اچانک الماری کے قدِ آدم شیشے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ بدن پر لنگوٹی، داڑھی اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے، سُرخ آنکھیں، ہاتھ میں نیزہ۔ اُف ...... والیا، اس نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔ اتنے میں اس کی بیوی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''اچھا تو میں چلتی ہوں، آپ کے لیے کھچڑی بنا دی ہے۔ دہی فرج میں رکھا ہے۔''

بیوی اپنی ساڑی کی چنٹیں ٹھیک کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے ہونقوں کی طرح بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک بولا ''سنو''
بیوی جاتے جاتے رُک کر مڑی ''کیا ہے؟''
اس نے دھیان سے دیکھا، بیوی نے وہی بارہ ہزار والی ساڑی پہنی تھی جو اس نے پچھلے ہفتے خریدی تھی۔ گلے میں قیمتی ہار، منگل سوتر، کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں، گھڑی، ناک میں کیل، اس کے بالوں کا جوڑا بہت پُرکشش لگ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔
بیوی شرما گئی، اس نے ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا کر کہا ''کیا ارادہ ہے؟''
''کچھ نہیں ......'' وہ ہڑ بڑا گیا، پھر سنبھل کر پوچھا
''کب تک لوٹو گے تم لوگ؟''
''برتھ ڈے کی تو پارٹی ہے، جلد ہی آجائیں گے۔''
اتنے میں نیچے سے پپو کی آواز آئی۔
''ممّی! چلونا، کیا کر رہی ہو کب سے؟''
''اچھا جاؤ، دیکھو بچّے انتظار کر رہے ہیں۔''
بیوی چلی گئی، دروازہ ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ خود بخود بند ہو گیا۔ جانے وہ کتنی دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گھڑی کی ٹِک ٹِک کے سوا دوسری کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس خاموشی سے اسے وحشت ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا پھر شیشے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک اپنے ہی عکس کو گھورتا رہا۔ پھولے گال، چھوٹی آنکھیں، بڑھا ہوا پیٹ، سر کے بال نصف سے زیادہ اُڑ چکے تھے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے تیزی سے اُڑتے بالوں پر تشویش کا اظہار کیا تو بیوی نے کہا تھا۔
''آپ کو معلوم ہے آدمی گنجا ہونے لگتا ہے تو اس کی ہتھیلی میں دولت کی لکیریں زیادہ گہری ہونے لگتی ہیں۔ چوڑی پیشانی دولت کی نشانی ہے۔''
اس وقت وہ مسکرا کر چپ ہو گیا تھا، مگر اب وہ سوچنے لگا، بیوی کا وہ جملہ کتنا خود غرضانہ تھا، اسے اپنے بال بے حد عزیز تھے۔ وہ منٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال درست کیا کرتا تھا۔ اور اس کی بیوی کے نزدیک گویا اس کے بالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ بس ہتھیلی میں دولت کی لکیریں گہری ہوتی جائیں۔ دولت، دولت، دولت۔ کیا مِلا اسے اتنی دولت کما کر؟ یہی نا کہ اس کے بچّے کانوینٹ میں پڑھنے لگ گئے۔ فرج کا ٹھنڈا پانی پینے اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانا سیکھ گئے۔ بیوی قیمتی ساڑیاں اور زیوارت پہن کر اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو مرعوب کرنے کا ہنر جان گئی۔ ماں کاشی یاترا کے لیے روانہ ہوگئی مگر اسے کیا مِلا۔ گنجاپن، بے خوابی گھبراہٹ، ڈپریشن اور کبھی کبھی دل کو مسوس دینے والی اُداسی؟ اسے پانچ سال پہلے جنتا چال کی اپنی چھوٹی سی کھولی یاد آ گئی۔ جس میں سیلن کی وجہ سے عجیب سی بدبو پھیل گئی تھی۔ دیواروں میں لونا لگا تھا اور برسات کے موسم میں چھت کثیر البول مریض کی طرح قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی تھی۔ راتوں میں مچھر جتھوں کی شکل میں یلغار کرتے اور بے شمار کھٹمل ان کا خون چوستے رہتے۔ اس سب کے باوجود وہاں کبھی اسے بے خوابی کی شکایت نہیں ہوئی تھی، نہ اس پر گھبراہٹ کے دورے پڑتے تھے۔ نہ اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوا تھا۔ ٹھیک ہے وہاں اسے فرج کا ٹھنڈا پانی نہیں ملتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کی بجائے چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانا پڑتا تھا۔ ڈنلپ کے نرم گدّوں کی بجائے گٹھلی دار گدڑیوں پر سوتا تھا، مگر گہری نیند سوتا تھا، آج اس نے اپنے فلیٹ میں آرام و آسائش کی ہر چیز مہیّا کر لی تھی۔ مگر من کی شانتی گنوا بیٹھا تھا۔ اب وہ چار گھنٹوں کی نیند کے لیے بھی سلیپنگ پلس کا محتاج تھا۔ اس کے فرج میں مرغی انڈا، مٹن مکھن سب بھرا رہتا تھا۔ مگر اسے صرف دہی اور چاول ہی کھانا پڑتا۔ ڈاکٹر کی ہدایت بھی یہی تھی۔ اس نے اپنے پھولے پیٹ پر ہاتھ پھرایا۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر اب پھولا پیٹ عجیب بدوضع لگ رہا تھا۔ اس نے دیوار پر لگی اپنی تصویر کی طرف دیکھا، آئینے میں کھڑی پرچھائیں اور اس تصویر میں کتنا فرق ہے۔ دس برس پہلے کتنا اسمارٹ تھا وہ۔
دس برس، دس صدیاں، دس ہزار صدیاں، سچ مچ اس نے دس برس میں کافی لمبی مسافت طے کر لی تھی، اتنی لمبی کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی ناممکن تھا۔
یہ آرام دہ فلیٹ، قیمتی فرنیچر، اعلیٰ قسم کی کراکری، نفیس کپڑے، زیورات دس برس پہلے اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ تو کیا وہ ان ساری چیزوں کو کسی ندی میں بہادے؟ کسی خیراتی ادارے کو خیرات کر دے پھینک دے، جلا دے کیا کرے؟ کیا کرے آخر؟ یہ ساری چیزیں جو، اب اس کی اور اس کی بیوی کی زندگی کا لازمی جز بن چکی تھیں۔ جن کے بغیر اب ان کے لیے زندگی کا کوئی تصوّر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ساری چیزیں یک بیک ضائع کر دینا اب ممکن ہے؟
اٹالین گھڑی کا پنڈولم ہِل رہا تھا۔
''نہیں، نہیں......نہیں، نہیں''
وہ خود بدل سکتا تھا۔ مگر اپنے سارے گھر والوں کو بدلنا کیونکر ممکن تھا؟
کیا اس کی بیوی اور بچّے دس سال پیچھے کی زندگی میں لوٹنے کو تیار ہو جائیں گے؟ ہر گز نہیں۔
اس کی بیوی تو اب نئے ماحول میں ایسے رچ بس گئی تھی جیسے اس نے غربت کے دن دیکھے ہی نہ تھے، وہ میک اَپ کرنا، شاپنگ پر جانا، اور پارٹیوں میں شریک ہونا ایسے سیکھ گئی تھی جیسے یہ سب اس کے خاندان میں پشتہا پشت سے چلا آرہا ہو۔ اس کی بے شمار سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اس نے کہیں شام کی انگلش کلاس بھی جوائن کر لی تھی۔ اور ضرورت پر ویل کم، گڈ بائی، گڈ مارننگ، ہاؤ آر یو اور فائن جیسے الفاظ روز

مرّہ کی گفتگو میں کثرت سے استعمال کرنے لگی تھی۔

اب اس کے گھر کے سبھی لوگ ناشتے کو بریک فاسٹ اور دوپہر کے کھانے کو لنچ کہنے لگے تھے۔ پہلے اس کی دونوں لڑکیاں میونسپلٹی کے اسکول میں پڑھتی تھیں، مگر اب دونوں کانوینٹ میں پڑھنے لگی تھیں۔ لڑکا کامکس پڑھتا تھا۔ ابھی اس کی ناک بہنا بند نہیں ہوئی تھی مگر بیوی نے اعلان کردیا کہ وہ اسے پائلٹ بنائے گی۔

عرصہ ہوا اس کی بیوی نے زمین پر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

ماں کو اس کی اندرونی اور بیرونی سرگرمیوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ بس وہ آئے دن بھجن، کرتن اور پوجا پاٹھ میں اپنا وقت گزار لیتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے بہو اور پوتے پوتیوں کو پھولتا، پھلتا دیکھ کر سمجھتی تھی کہ یہ ساری خوشی اطمینان اور سکون اسی کی اپاسنا اور پرارتھنا کا نتیجہ ہے۔ اس کی انتم اچھا تھی کہ وہ ایک برس کاشی میں گزارے، اور اب پچھلے چار مہینے سے ماں کاشی میں تھی اور ایشور درشن سے آتم شانتی لابھ کررہی تھی۔

بظاہر اس کے اردگرد سب کچھ بہت اطمینان بخش تھا۔ اطمینان بخش۔ پُرسکون اور مسرّتوں سے پُر۔

مگر جانے کیوں، کبھی کبھی وہ بے حد اُداس ہوجاتا۔ اس وقت نہ اسے فرج کا ٹھنڈا پانی اچھا لگتا نہ پنکھے کی ہوا سُہاتی۔ اس وقت اسے بیوی کا میک اَپ زدہ چہرہ کسی بھُتنی کے چہرے سے مشابہ دکھائی دیتا اور بچّوں کی قلقاریں سانپوں کی پھپھکاریں معلوم ہوتیں۔

پانڈے سیّد اور نائر کی دوستی نے اسے اس اُداسی سے چھٹکارا پانے کا گُر بتادیا تھا، اور اب وہ کم از کم اتنی شرابوں کے نام جاننے لگا تھا جتنی اس کی ہتھیلی کی لکیریں۔

''رَم ...... دشمنِ غم'' اسے اپنے ایک شاعر دوست کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

رَم ...... ہاں...... اور اس نے جلدی سے کتابوں کی الماری کھولی اور کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھی ہوئی رَم کی بوتل نکالی۔ گلاس لے کر پھر کُرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ دو بڑی چُسکیوں نے ہی اس کی اُداسی کو اس طرح چھانٹ دیا جیسے بارش کی پہلی پھوار تالاب پر جمی کائی کو چھانٹ دیتی ہے۔

''ہُم......اس نے میز پر پڑی رامائن کی طرف دیکھا، مگر اب اس کے اندر کوئی ہلچل نہیں ہوئی، وہ اب نارد کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے مستعد تھا۔

ساقی فاروقی

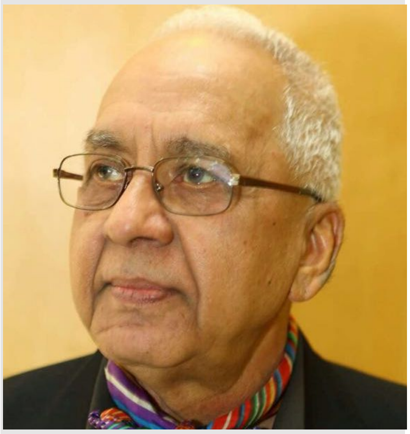

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' ان سے منسوب ہوگا جس میں **اسد محمد خان، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

کہاں ہے وہ سوال؟ اس نے تیسری چُسکی لی اور رامائن کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ نارد نے مسکرا کر پوچھا۔

''بتا تو یہ کُکرم کس کے لیے کرتا ہے؟''

ہش......ش......ش......کُکرم، یہ کُکرم ہے؟ جو کچھ میں کررہا ہوں وہ کُکرم ہے؟ یعنی ایک اچھے معقول مکان کی خواہش کرنا، بچّوں کو اچھی تعلیم دلانا، بیوی کو پہنانا اوڑھانا، ماں کی خواہش کا احترام کرنا یہ سب کُکرم ہے؟

نارد کا دوسرا سوال سانپ کی طرح پھن اُٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟''

اور یک بیک اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کرگیا۔ اس نے دوبارہ رامائن کو بند کرکے ایک طرف کو سرکا دیا۔ اسے اب رامائن سے ڈر لگنے لگا۔ اس نے رامائن اس لیے پڑھنا شروع کیا تھا کہ من کو شانتی ملے۔ یہاں تو اس کا سارا سکون حرام ہوگیا تھا۔ اسے اب بیوی پر غصہ آنے لگا۔ اسی نے تو اسے مشورہ دیا تھا کہ گھر میں پڑے پڑے تمھارا من گھبراتا ہوگا۔ دھارمِک پستکیں پڑھو، من کو شانتی ملے گی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا معمولی سا بلڈ پریشر ہے، چار چھ روز کے آرام سے نارمل ہوجائے گا۔ اس نے بھی سوچا ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے، اس ایک ہفتے کو دھارمِک ہفتہ سمجھ کر منالیں گے۔ دارو، سگریٹ اور ماس تو خود ڈاکٹر منع کرچکا ہے۔ تھوڑا دھارمِک پستکوں کا اَدّھین کرلیں گے۔ دھرم پالن ہوجائے گا، اس نے شروع کے دو تین روز گیتا کا پاٹھ کیا۔ مگر اس میں تو صرف بھگوان کرشن کے اُپدیش ہی اُپدیش تھے۔ اسے مزا نہیں آیا۔ پھر اس نے رامائن پڑھنا شروع کیا مگر شروع کے صفحات پر ہی والیا اور نارد کے واقعہ نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ رامائن کو اس نے اپنے سے دور تو سرکا دیا۔ مگر جوں ہی اس پر نظر پڑتی اسے نارد کا سوال سُنائی دیتا۔ ''تو یہ سب کُکرم کس لیے کرتا ہے؟''

اب وہ نارد کو کیسے سمجھائے کہ آج کے زمانے میں اپنی تنخواہ کے علاوہ اوپر سے پانچ دس ہزار کا کمانا کوئی کُکرم نہیں ہے۔ بیوی کو چند زیورات بنا دینا بچّوں کو کانوینٹ اسکول میں پڑھانا، گھر میں ٹی وی، فرج

اور ڈائننگ ٹیبل کا رکھنا، پاپ نہیں آج کی ضرورت ہے۔ماحول کا تقاضا ہے۔

جب تک یہ چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں، وہ لوگوں کی نظروں میں کتنا حقیر تھا۔

پانڈے اکثر اس سے کہتا ''بیٹا! اپنی روش نہیں بدلو گے تو ایک دن دس بائی دس کی کھولی میں خون تھوکتے مرجاؤ گے اور بیوی بچّے سڑکوں پر بھیک مانگتے پھریں گے۔''

بظاہر وہ پانڈے اور دوسرے ساتھیوں کی ان چبھتی باتوں کو ہنس کر ٹال جاتا، مگر اندر جب گہرے میں سے کچھ چٹختا سا محسوس ہوتا، دل ڈوبنے لگتا اور ایک لمحے کو اس کی نظروں کے سامنے اپنی بیوی اور بچّوں کی تصویر گھوم جاتی۔

اس کی جوان اور خوبصورت بیوی کسی بنگلے میں جھوٹے برتن مانجھ رہی ہے۔اس کا بلاؤز جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ساڑی پھٹ گئی ہے اور بنگلے کے موٹے سیٹھئے کی نظریں اس کے بدن کے عریاں حصّوں پر گڑی جا رہی ہیں۔اس کے بچّے فٹ پاتھ پر بیٹھے...... ریا...... ریا کر راہ گیروں سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ماں ...... ماں کی لاش کمرے کے سیلن زدہ فرش پر تختہ بنی پڑی ہے۔اُف اس کی پیشانی پر پسینہ چھلچھلاتا آتا اور اسے لگتا وہ اچانک اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ ایک معمولی سی ٹھوکر پر بھی ریت کے گھروندے کی طرح بکھر جائے گا اس وقت اس کے کانوں میں جیسے کوئی زور زور سے چیخنے لگتا۔

''اپنی روش بدلو، ورنہ خون تھوکتے تھوکتے مرجاؤ گے۔''

ساتھیوں کے زہر میں بجھے جملے ، بیوی کی حسرت بھری فرمائشیں، بچّوں کی تڑپ، ماں کی کھانسی ۔آخر ایک دن وہ اپنی روش بدلنے پر مجبور ہوگیا۔مگر یہ تبدیلی اس کے اندر دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ بہت ٹھیک ٹھاک ہوتا گیا تھا۔

گھر میں بیوی کا مرجھایا چہرہ کنول کی طرح کھلنے لگا، بچّوں کی چہکار میں اضافہ ہوتا گیا۔ ماں کی کھانسی کم ہوتے ہوتے بند ہوگئی۔سب خوش تھے اور سب کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش تھا مگر آج والیا کی کتھا نے اُسے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔

اس نے رم کا تیسرا پیگ بنایا۔

سچ! وہ کیوں بیوی بچّوں کے لیے اپنے آپ کو گناہ گار کرے، انھیں پالنے کی ذمہ داری ضرور اس کی ہے۔اور وہ انھیں اپنے ضمیر کو آلودہ کئے بغیر بھی پال سکتا ہے۔ یقیناً اس نے یہ سب ایک بہتر زندگی کے حصول کی خاطر کیا تھا مگر اس کی زندگی کا رس تو اس کے بیوی بچّوں کو طراوت بخش رہا تھا۔اس کے حصے میں تو زہر ہی زہر آیا تھا۔

وہ تیسرا پیگ بھی خالی کر گیا اور انتہائی تلخی سے منہ بنا کر خالی گلاس کو گھورنے لگا۔تھوڑی دیر تک خالی گلاس کو گھورتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے بوتل اُٹھائی اور چوتھا پیگ اُنڈیلنے لگا۔

''بس ......کل وہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے گا کہ اب وہ مزید بار اُٹھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ورنہ اس کے کاندھے ٹوٹ جائیں گے وہ لوٹ رہا ہے۔ وہ دس برس پیچھے لوٹ رہا ہے۔آگے بڑھتے وقت بیوی ہمیشہ اس کی پیٹھ ٹھونکتی رہی تھی ۔اب پیچھے لوٹنے میں بھی اس کا ساتھ دے مگر کیا وہ مان جائے گی؟ ماننا ہی پڑے گا۔ بہت ہوگیا، آدمی سونے کا نوالہ کھائے، مگر من کی شانتی نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ اب وہ صرف وہی کرے گا جو اس کا ضمیر کہتا ہے۔

چوتھا پیگ بھی ختم ہوگیا، اب وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا جھوم رہا تھا۔دیواریں کھڑکیاں، کمرہ کمرے کی ہر چیز، اس کے گرد رقص کر رہی تھی، اور وہ اپنی گردن کبھی ادھر کبھی اُدھر گھماتا لہک لہک کر انھیں رقص کرتا دیکھ رہا تھا۔

میز پر رکھی بوتل بھی آہستہ آہستہ تھرکنے لگی، اس نے ہاتھ بڑھا کر بوتل کی گردن دبوچ لی۔گلاس میں شراب اُنڈیلی، گلاس کو آنکھوں کے برابر لاکر پیگ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔مگر اندازہ لگانا مشکل تھا، ایک پر ایک دو دو تین تین گلاس چڑھے ہوئے تھے۔اس نے تھک ہار کر گلاس کو پھر میز پر رکھ دیا۔ اور جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنا چاہا۔ جگ خالی تھا، اس نے جھنجھلا کر جگ دوبارہ میز پر پٹکا اور گلاس اُٹھا کر منہ سے لگالیا۔ نیٹ رم ایک جلتے تیر کی طرح حلق کو چھیلتی ہوئی معدے کے اندر اُتر گئی۔اس نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔ گلاس کو میز پر پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔مگر پیر بُری طرح لڑکھڑا گئے۔ڈگمگا کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔اب کمرہ اور کمرے کی چیزوں کا رقص بہت تیز ہوگیا تھا، اور ساری چیزیں ایک خاص لَے میں پوچھ رہی تھیں۔

''تو یہ کرم کس کے لیے کرتا ہے؟''

'تو یہ کرم کس کے لیے کرتا ہے؟''

اسے غصہ آگیا، وہ پھر لڑکھڑاتا ہوا کرسی سے اُٹھا۔اس نے اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے جیسے گردش کرتے کمرے اور رقص کرتی چیزوں کو تھام کر اپنی اپنی جگہ کھڑا کر دینا چاہتا ہو۔ ہر چیز اس کے پاس سے کترا کر نکل رہی تھی، وہ دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر چیزوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔مگر کوئی چیز اس کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ بالآخر وہ تھک گیا، تھک کر ہانپنے لگا۔ چیزوں کا رقص جاری تھا۔ اچانک کمرے کی دیواریں اپنی جگہ سے سرک سرک کر اسے دبوچ لینے کو بڑھیں۔چھت بیٹھنے لگی، وہ لڑکھڑا کر گرا، یکے بعد دیگر کمرے کی اشیاء اس پر ڈھیر ہوتی چلی گئیں اور اس کا دم گھٹنے لگا۔آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں، اس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

□□□

کہیں سے ایک شروعات

تبسم فاطمہ
D-304، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی
موبائل: 9958583881

ندیوں میں چھوٹی چھوٹی لہریں بنتی ہیں اور گم ہوجاتی ہیں ۔ مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ میں اس پورے سسٹم سے غائب کردی گئی ہوں ۔ یہ خود احتسابی کا پہلا جائزہ تھا جس نے مجھے گہری نیند سے بیدار کیا۔ میں غائب یا ان وزیبل ہوگئی ہوں تو واپس کیسے آ سکتی ہوں ؟ اس وقت یہ پہلا سوال تھا جو مجھے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں اس وقت جا گی تھی جب محلے کی باربی ڈول یعنی رضیہ آپا کا معاملہ میرے سامنے آیا تھا۔ میں انہیں باربی ڈول کہتی تھی۔ وہ ایک پیاری سی گڑیا تھیں میرے لئے ۔انتہائی ذہین ۔آس پاس کے گھروں میں رضیہ آپا کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ابھی صرف ایک برس ان کی شادی کو ہوئے تھے۔ رضیہ آپا اس شادی کے لئے تیار نہیں تھیں۔ بزنس مینیجمنٹ کرنے کے بعد ایک بڑی کمپنی کو انہوں نے جوائن کیا تھا۔ ہینڈسم سیلری تھی۔ لڑکے کے گھر والوں کو رضیہ آپا کا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔لڑکا انجینئر تھا۔ پنج وقتہ نمازی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ تبلیغی جماعت سے بھی اس کا تعلق ہے ۔گھر والوں کے دباؤ کے آگے رضیہ آپا ٹوٹ گئیں۔ جاب چھوڑ دیا۔ شادی ہوگئی۔ اور صرف ایک برس کے بعد الزامات کا تحفہ لے کر وہ گھر لوٹ آئیں۔شادی ٹوٹ چکی تھی۔ دنیا بھر کی باتیں ہورہی تھیں ۔لیکن میں مطمئن تھی۔ میرے اندر کا سمندر شانت تھا۔لیکن ایسا کیوں تھا؟ اس کا جواب مجھے دو دن بعد ملا جب میں رضیہ آپا سے ملاقات کے لئے ان کے گھر گئی ۔لمحوں کی کچھ سلوٹیں ان کے چہرے پر رہ گئی تھیں۔ حادثے کے نقوش ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں، میں اب بھی دیکھ سکتی تھی مگر اس کے علاوہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی حیات کا کارخانہ، جہاں عورت ایک دن کباڑ کی طرح پھینک دی جاتی ہے اور بے وقعت ہوجاتی ہے۔ قیمت گر جاتی ہے۔اسکا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا۔

'ڈیل مکمل کیوں نہیں ہوئی رضیہ آپا ؟ میرا پہلا سوال تھا۔

رضیہ آپا چونک گئی ۔مطلب؟

''شادی کی ڈیل ؟۔ میں نے بے رحم پتھر ان کی طرف اچھالا ۔'انٹرنیشنل کمپنی میں بڑی جاب اور بڑی سیلری پانے والی لڑکی کو کیا اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ شادی بھی ایک ڈیل ہوتی ہے۔آپ نے اپنے حصے کی گھٹن مانگ کر سستا سودا کیا۔اور جس سے آپ کی ڈیل ہوئی، اس نے آپ کو زندگی سے نکال باہر کیا۔ میرے اندر کا غصہ ہونٹوں پر آ گیا تھا۔آپ ذمہ دار کس کو مانتی ہیں۔؟''

'میں خود ہوں' رضیہ آپا کی آنکھوں میں لرزتے موتیوں کے قطرے تھے، لیکن یہ قطرے آنکھوں سے چھلکے نہیں۔

'آپ ذمہ دار نہیں ۔ یہ معاملہ ایسا تھا جیسے آپ پر پستول تان کر آپ سے ڈیل فائنل کرائی جارہی ہو۔ آپ کی سیلری کتنی تھی؟'

'ایک لاکھ سے کچھ زیادہ'

پہلی غلطی آپ کے گھر والوں کی ہے۔ اب یہ سیلری آپ کے گھر والوں کو ہر ماہ آپ کو دینی چاہئے۔ اور جس نے کنٹریکٹ توڑا ہے، سزا کے طور پر ایک بڑا جرمانہ اسے ادا کرنا چاہئے۔'

رضیہ آپا غور سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں ۔کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا-'اچھا ہوا تم آ گئی ۔اب جیوں گی ۔ اب کوئی ڈیل نہیں کروں گی۔ اب ہر ڈیل میں خود فائنل کروں گی۔'

ان دنوں میں بھی بزنس مینیجمنٹ کی پڑھائی کررہی تھی۔ میرا محبوب موضوع سیاست تھا۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی میں رضیہ آپا کا خیال اپنے دل سے نکال نہیں سکی ۔عورت سسرال سے گھر واپس بھیج دی جائے تو ہمارا معاشرہ اس مظلوم لڑکی کا جینا بھی دوبھر کر دیتا ہے ۔رضیہ آپا کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو سن کر میں پریشان ہوگئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ایک راستہ ہے جہاں سے آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے ۔شادی ایک ایسا سوشل کنٹریکٹ ہے، جہاں لڑکیوں کی مرضی نہیں پوچھی جاتی ۔ پھر لڑکی کو ایک ان دیکھے جہنم کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں رضیہ آپا کے حوالے سے پہلا مضمون لکھا تھا۔غیر قانونی ڈیل۔ میں نے اس مضمون میں بہت سے سوال اٹھائے تھے۔ زندگی گزارنے کے سب سے اہم مسئلہ پر آج بھی ہمارا معاشرہ سنجیدہ نہیں ہے۔عورتوں کے مخصوص ان جی اوز اور وومین سیل ہونے کے باوجود کتنی فیصد عورتیں اپنے حقوق کے لئے وومین سیل تک پہنچے کی جرأت کرتی ہیں۔؟ شادی ایک ایسا سوشل کنٹریکٹ ہے جہاں محض ایک برس بعد بھی اگر شوہر

بیوی کو چھوڑنے کو ٹھان لے تو اس کے لگائے گئے بیہودہ الزامات کے بوجھ تلے عورت اس قدر دب جاتی ہے کہ اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ یہ پورا سسٹم مرد چلاتا ہے۔ معاشرہ سے آئین تک عورت پر مرد کا دبدبہ ہے اور بولنے والا کوئی بھی نہیں۔ مضمون لکھنے سے قبل میں رضیہ کے کمزور و مجبور ماں باپ سے ملی تھی۔ میں نے پوچھا تھا کہ آپ رضیہ کے سسرال والوں سے کیوں نہیں ملے؟'

'اپنی اور بدنامی کرانے کے لئے۔؟' رضیہ آپا کے ابو کا خاموش جواب تھا۔ میری بیٹی ایک انٹرنیشنل کمپنی میں کام کرتی تھی۔ کسی لڑکی کو بدنام کرنے کے لئے اتنا حوالہ کافی ہوتا ہے۔

'مطلب؟' میں چونک گئی تھی۔ پھر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ یہ سسٹم کس قدر خوفناک ہے۔ یہاں کے لوگ کس قدر تنگ نظر ہیں۔ بڑی کمپنی مطلب لڑکوں سے میل جول۔ ذہن میں ہزاروں افسانے تیار کر لئے گئے ہوں گے۔ یعنی موجودہ سسٹم میں، آج بھی اس مہذب صدی میں عورت تعلیم حاصل نہیں کرے۔ جاب نہیں کرے۔ گھر بیٹھ کر دلھن بننے اور زندگی بھر گھٹ گھٹ کر مرنے کا انتظار کرے۔

میرا مضمون شائع ہو گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا، ہم میں سے ہر لڑکی رضیہ آپا کی طرح ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کہانیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہ معاشرہ صدیوں سے ایک ہی پٹی پٹائی لکیر پر چل رہا ہے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد ایک طوفان میرے گھر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ابو، امی اور بھائی کی موجودگی میں اخبار میز پر رکھا تھا۔ میں اپنے گھر کے کورٹ روم تھی اور مجھے ہنسی آ رہی تھی کہ اس مہذب دنیا میں ایک لڑکی کو لکھنے تک کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

میرا بھائی پوچھ رہا تھا۔ 'یہ کیا ہے؟

'یہ وہی ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ اور یہ آئندہ بھی ہوگا۔ اور تمہیں اس سے کوئی تکلیف ہے تو تم گھر چھوڑ کر جا سکتے ہو۔' میں نے ابو کی طرف دیکھا۔' میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے لئے کسی سے بھی اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اجازت میں نے اپنے ضمیر سے لی اور ضمیر نے مجھے کھل کر اجازت دی کہ سسٹم میں تبدیلی اس لئے نہیں آتی کہ کوئی بھی تبدیلی کو لانا نہیں چاہتا۔'

مجھے حیرانی تھی کہ ایک چھوٹی سی بات پر پورا گھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ میرے لئے عجیب تجربہ تھا کہ عورت کے لکھنے پر بھی پابندی ہے۔ یعنی میں وہی لکھوں جو گھر والے چاہتے ہیں۔ مجھے تعجب تھا، ہر جگہ عورت وہی گونگی بہری ہے۔ میں اس وقت چونک گئی جب گھر کی دہلیز کے اندر رضیہ آپا کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں اخبار تھا۔ انہوں نے پہلا سوال کیا۔

'یہ تم نے لکھا۔؟'

'ہاں۔ کیوں؟'

'پہلے میرے گلے لگ جاؤ۔'

میں گلے لگ گئی۔ رضیہ آپا کی بے قرار آواز میں جیسے سمندر کی ہزاروں لہریں شامل ہو گئی تھیں۔ 'تم نے میرے دل کی آواز لکھ دی۔ آج بہت حد تک خود کو ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔'

'لیکن اتنا کافی نہیں ہے رضیہ آپا۔ کیا آپ خود پر لگے الزامات کو بھول گئیں؟'

'نہیں بھول سکتی'

'پھر جواب دیجئے۔'

'کیسے جواب دوں؟' رضیہ آپا کی آواز کمزور تھی۔

'آپ کا شوہر کسی مذہبی جماعت سے جڑا ہوا تھا۔؟' میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

'ہاں'

'داڑھی رکھتا تھا!'

'ہاں۔'

'اس کے لگائے گئے الزامات جھوٹے تھے۔؟'

'ہاں۔'

'پھر یہی الزامات آپ لگائیں گی۔ اس نے ایک سوشل کنٹریکٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ایک بڑا جرم کیا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اس کا جواب دیں۔'

رضیہ آپا گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ لیکن میں صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ وہ جھوٹے الزامات کی قید سے ذہنی طور پر آزاد ہونا چاہتی تھیں۔

میں جانتی تھی کہ آئندہ میں جو قدم اٹھانے والی ہوں، اس کے لئے میرا گھر بھی میرا ساتھ نہیں دے گا۔ اس دنیا میں بدنامی، رسوائی، ذلت کا بوجھ صرف عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مرد ایک آزاد پرندہ ہے۔ اور اسی لئے رضیہ آپا جہاں گھر کی گھٹن میں قید تھیں، وہاں مجھے یقین تھا کہ سالم علی انجینئر کسی نئی لڑکی کے شکار کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔ اس درمیان دو تین دن میں الگ الگ ٹی وی چینلس کے چکر لگاتی رہی۔ ایک مشہور ٹی وی چینل کی اینکر سدھا نے مجھے وقت دیا۔ میں نے اسے رضیہ آپا کی کہانی سنائی۔ کہانی سننے کے بعد اس نے پوچھا۔ 'اس میں نیا کیا ہے؟'

'آپ کو نظر نہیں آ رہا؟' میں نے حیرت سے پوچھا۔

'بالکل بھی نہیں۔ آپ بتایئے۔'

اس طرح کی شادیاں جہاں لڑکی کی مرضی نہیں پوچھی جاتی، ایک ناجائز سوشل ڈیل ہے۔ جس میں ذہنی جسمانی ہر طرح کا نقصان صرف عورتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔' 'اس پروگرام کی ٹی آر پی ویلیو کیا ہوگی؟' سدھا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میڈم آپ میرا ساتھ دیں تو اس کی ٹی آر پی بنائی جا سکتی ہے۔'

'وہ کیسے!'

'چلئے وہ بھی طئے کر لیں گے۔ مجھے اس انجینئر، کیا نام بتایا آپ نے!

'سالم علی۔'

میں اس کو بھی اسٹوڈیو کھینچ لاؤں گی۔ آپ بتا رہی تھیں، اس کا تعلق مذہبی جماعت سے ہے......؟'

'ہاں۔'

سدھا گہری سوچ میں تھی۔ 'کہانی کو دلچسپ

بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ کل کا پروگرام رکھتے ہیں۔ تب تک ہم اسکرپٹ پر کام کر لیں گے۔'

میں اس وقت سدھا کی بات سمجھ نہیں سکی تھی۔ ٹی وی چینلز کی ریٹنگ کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں تھی۔ اسٹوڈیو جانے سے قبل میں نے رضیہ آپا سے دیر تک بات کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سالم علی کو اچانک کے اس پروگرام سے چکر ضرور آ جائیں گے۔ سات بجے ہم اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ سدھا نے پروگرام کا نام دیا تھا۔ ایک اور طلاق۔ ان دنوں ٹی وی چینلز پر زیادہ تر گفتگو طلاق کو لے کر ہو رہی تھی۔ پروگرام شروع ہوا۔ شروعات میں سدھا نے ہمیشہ کی طرح ایک خاص مذہب کو ٹارگیٹ کرتے ہوئے طلاق کے نقصانات بتائے۔ پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسٹوڈیو میں بولنے کے لئے رضیہ آپا کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ رضیہ آپا کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ سدھا کی گرجتی ہوئی آواز ماحول میں گونج رہی تھی۔ "پہلے تین طلاق ۔عورت کے ماتھے پر ایمان کا ایسا داغ جسے دھونے میں صدیاں لگ گئیں۔ لیکن اب بھی کیا ہو رہا ہے؟ مسلم سماج کے ان چہروں کو پہچانئے جن کی تعداد حیدرآباد سے بنگلور اور چنئی سے دہلی تک بڑھتی جا رہی ہے۔ نکاح نہیں ہوا، ایک کھیل ہو گیا۔ ایک سال تک عورت کو بیوی کے نام پر روندا، مسلا اور پھر طلاق دے کر چھوڑ دیا۔

اسٹوڈیو کے اسکرین پر سالم علی کا چہرہ ابھرا۔ اسی کے ساتھ سدھا کی آواز میں اور تیزی آ گئی۔ اب اس چہرے کو دیکھئے۔ عمر 40 سال۔ نام سالم علی۔ پیشے سے انجینئر۔ مسلم عورتوں کو بدحالی تک لے جانے والے ان چہروں نے طلاق کو کھیل بنا دیا ہے۔ بیوی کی موجودگی میں دوسری عورتوں کو لے کر گھر آنا اس کا مشغلہ ہے۔ شراب پیتا ہے۔ دیر رات تک لیپ ٹاپ پر اپنی راتیں رنگین کرتا ہے اور شادی جیسے پوتر رشتے کو کلنکت کرتا ہے۔'

میں ڈر گئی تھی۔ میں نے ایک کمزور سی آواز اٹھائی۔ 'کیا طلاق صرف مسلمانوں میں ہوتی ہے۔؟'

رضیہ آپا کا چہرہ برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔' آپ دوسری مسلم عورتوں کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔ میری بات کیجئے۔ میں جواب دوں گی.....'

اس بار میرا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا تھا۔ 'سپریشن اور طلاق کی شرحیں دوسری قوموں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن مجھے اچانک احساس ہوا، سدھا نے اپنے پروگرام کی ٹی آر پی بڑھالی ہے۔ پروگرام کو غلط رنگ دے دیا ہے۔ میں نے سوچا تھا، شادی جیسے اہم فریضہ کو لے کر اس سوشل کنٹریکٹ کی بات کی جائے گی جسے کوئی بھی مرد اس لئے توڑ دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے، عورت کمزور ہے۔ لیکن مرد بھول جاتا ہے کہ آج کی عورت اپنے حق کے لئے عدالت سے میڈیا اور چینل تک کا راستہ اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن اس پروگرام میں شادی کا مسئلہ کھو گیا تھا، سوشل کنٹریکٹ کے پنجرے سے میڈیا والوں نے چابک چلانے کے لئے اچانک مسلمان قوم کو برآمد کر لیا تھا۔

ایک گھنٹے کے اس پروگرام کے بعد خود میری زندگی میں کیا طوفان آ سکتے ہیں، مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔ میرے گھر والے خلاف تھے۔ ابو نے بس اتنا کہا کہ تم حد سے باہر جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ امّی کی سناٹے میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ بھائی میری طرف غصہ میں دیکھ رہا تھا۔ ساری دنیا مسلمانوں کے پیچھے پڑی ہے۔ تم نے میڈیا کو مسلمانوں کی مخالفت کا ایک اور تحفہ دے دیا۔'

میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ موجودہ وقت کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ کیا میں نے غلطی کی تھی؟ کیا کسی کو حق دلانا جرم ہے؟ اس رات رضیہ آپا کی خوفزدہ آواز سننے کو ملی۔ 'سالم علی کا فون آیا تھا۔ ابو نے فون اٹھایا۔ اس کے گھر والے خوفزدہ ہیں۔ وہ معافی مانگنے کو تیار ہیں۔'

'آپ کیا سوچتی ہیں؟'

'اس کے ساتھ جانے کا سوال ہی نہیں۔'

میں اس جیت سے خوش تھی۔ لیکن اس وقت تک یہ نہیں جانتی تھی کہ میڈیا کی ٹی آر پی کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ دوسرے دن میڈیا والوں نے ہمیں پھر بلانا چاہا۔ رضیہ آپا نے صاف منع کر دیا۔ میں اس وقت ان کے پاس ہی تھی۔ رضیہ آپا کے موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ دوسری طرف سدھا تھی۔ گفتگو کے دوران رضیہ آپا کا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ موبائل تھامے خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

'بات آگے بڑھ چکی ہے۔'

'لیکن ہوا کیا۔'

"سدھا مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں سالم علی کے خلاف یہ بیان دوں کہ وہ رات بھر لیپ ٹاپ پر اپنے دوستوں کو پیغام بھیجا کرتا تھا۔ ممکن ہے اس کے تار دہشت گرد تنظیموں سے جڑے ہوں'، رضیہ آپا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ صرف ایک فریب کا معاملہ ہے۔ اس نے مجھے فریب دیا ہے۔ لیکن میڈیا اسے مسلمان ہونے کے نام پر گھیرنا چاہتی ہے۔'

"ٹی آر پی بڑھانا چاہتی ہے اور ٹی آر پی مسلمانوں کو بدنام کرنے سے، انہیں دہشت گرد ٹھہرانے سے بڑھتی ہے۔ میں آہستہ سے بولی۔ 'سدھا کی بات میری سمجھ میں اب آئی ہے۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میڈیا ایسا بھی کر سکتی ہے..

'کیا ہم نے غلط کیا۔؟ میں نے رضیہ آپا سے پوچھا۔

'پتہ نہیں۔'

'کیا کوئی اور راستہ تھا؟'

'پتہ نہیں۔، رضیہ آپا رو رہی تھیں۔ لیکن یہ راستہ صحیح نہیں۔ اب لگتا ہے ہماری زندگی اور نجات کا کوئی راستہ عدالت اور میڈیا سے ہو کر نہیں جاتا۔'

میں ہار گئی تھی۔ میں خود سے ہار گئی تھی۔ زندگی میں ملنے والی یہ ایک ایسی شکست تھی، جس کے بارے میں، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اس وقت کمرے میں گہرا

سناٹا چھایا تھا۔ میں خوفناک آوازوں کی زد میں تھی۔ میں رضیہ آپا کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سالم علی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ دوسرے دن میڈیا والوں نے سالم علی کو کھوج نکالا تھا۔ میں اسے ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی۔ مگر وہ کوئی دہشت گرد نہیں ہے۔ وہ دہشت گرد نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنا قصور تسلیم کر رہا تھا۔ میں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے ابو کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف غصّے میں دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اس وقت کمرے میں صرف میں تھی۔ مجھے سکون چاہئے تھا۔ میں دہشت اور وحشت کے اس کھیل سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ میرے لئے یہ سوچنا مشکل تھا کہ حق کے لئے اٹھائی جانے والی ایک چھوٹی سی آواز کو بھی ہمارا میڈیا مسلمانوں کے خلاف استعمال کرسکتا ہے؟ یہ میری زندگی کی، اب تک کی سب سے بڑی شکست تھی۔ دوسرے دن رضیہ آپا کا فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ رضیہ آپا نے ملنے کے بعد بتایا کہ چینل والے مسلسل فون کر رہے ہیں۔ وہ اپنے لائیو شو میں بلانا چاہتے ہیں۔

’ہم ضرور جائیں گے۔‘ یہ میرا جواب تھا۔

رضیہ آپا نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، ’یہ تم کہہ رہی ہو؟‘

’ہاں۔‘ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ جو ہم سے چٹخارے لے رہے ہیں، انہیں بھی ہم سے جواب سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔‘

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وقت کی تیز تیز چلتی ہوئی آندھیاں ہمیں کہاں لے جائیں گی؟ میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ خوفناک سیاست کہاں کہاں ہمارا شکار کرسکتی ہے۔؟ اب یہ حقیقت سامنے تھی کہ محض ہمارے نام کا چٹخارہ نہیں لیا جا رہا ہے بلکہ چٹخارے کی آڑ میں ہمیں ہلاک کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بے وفائی کا قصہ پھیلتے پھیلتے دہشت گردی کے دائرے میں آ گیا تھا۔

میں دوبارہ اسٹوڈیو میں تھی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے چہرے جانے پہچانے تھے۔ میڈیا نے نفرت کا کھیل شروع کر دیا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں جانتی تھی، سکون کہاں ہے...... میرے چہرے پر بھرپور طمانیت تھی جبکہ لہجہ سخت تھا۔ بغیر جذباتی ہوئے میں نے بولنا شروع کیا۔ ’’چار دن قبل تک یہ کہانی صرف اتنی تھی کہ ایک شوہر نے ایک بیوی کو چھوڑ دیا۔ میں یہ ایشو اس لئے اٹھانا چاہتی تھی کہ شادی جیسے اہم فریضہ کو کچھ لوگوں نے ناجائز ڈیل بنا دیا ہے۔ مرد شادی کرتے ہیں اور پھر جھوٹے الزامات لے کر طلاق دے دیتے ہیں۔ ایسا ہر مذہب میں ہوتا ہے۔ مگر.....‘ سدھا نے تیز آواز میں مجھے روکنا چاہا۔ میری آواز سدھا سے زیادہ تیز تھی۔ ’’مسئلہ عورت کا ہے۔ عورت ہر مذہب میں عورت ہوتی ہے۔ عورت کو مسلمان یا ہندو مت بنایئے۔ کیونکہ تمام عورتوں کی گھٹن ایک جیسی ہے۔ تمام عورتوں کا درد ایک جیسا ہے۔ کسی بھی مرد کو عورت کے جذبات سے کھیلنے کا حق نہیں۔ عورت اور مرد کی برابری کی بات کیجئے۔ مسئلہ کو غلط موڑ نہ دیجئے۔‘‘

’میرا لہجہ سخت تھا۔ ’یہاں بہت کچھ بدل رہا ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی بچہ ایک خاص مذہب میں پیدا ہوتا ہے تو وہ گنہگار بن جاتا ہے۔ ایک خاص مذہب سے تعلق رکھنے والا شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو آپ طلاق کے روٹس کو پکڑنے کے بجائے اس میں ایک دہشت گرد کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اس شوہر کی صرف ایک غلطی ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر جھوٹی تہمت لگائی لیکن آپ کا میڈیا کیا کر رہا ہے؟ ہم یہاں انصاف کے لئے آئے تھے۔ لیکن یہاں تو انصاف کا جنازہ نکالتے ہوئے انسانی رشتوں میں بھی آپ دہشت گرد کو تلاش کر رہے ہیں۔

اس کے بعد رضیہ آپا نے مورچہ سنبھالا۔ ان کی آواز میں توازن برقرار تھا۔ انہوں نے اینکر کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اگر آپ لیپ ٹاپ یا کمپیوٹر پر دیر رات تک کام کرتی ہیں تو پھر آپ بھی آتنک وادی ہوگئیں؟ سالم علی کا صرف ایک قصور تھا۔ مجھے طلاق دینا تھا تو مجھ پر جھوٹے الزامات لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آ گئی تھی۔ یا کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا، اس کا اظہار مجھ سے کرتا تو میں خود اس کی زندگی سے دور نکل جاتی۔ سالم علی نے اعتبار کھویا۔ لیکن آپ کا میڈیا ہندوستان کا اعتبار کھو رہا ہے۔‘‘

اب میری باری تھی۔ میں نے سدھا کی طرف دیکھا۔ کیا ’آپ میں اور مجھ میں فرق ہے؟ لیکن فرق ہے۔ میں ایک اچھے مشن کے لئے آئی تھی۔ آپ نے ایک اچھا مشن غلط مقصد کے لئے ہائی جیک کرلیا۔‘

پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ میں اور رضیہ آپا خاموشی سے باہر نکل آئے۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ کافی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ کافی دیر بعد رضیہ آپا کی آواز سنائی پڑی

’کل میں ڈر گئی تھی...... لیکن آج......‘

’آج؟‘

’زندگی کا سامنا کرنا ہو تو اندر کا خوف نکال دو۔ وہ اس ماحول میں بھی مسکرا رہی تھیں۔

’آپ نے خوف نکال دیا؟‘

’پتہ نہیں۔ لیکن نکالنا ہوگا...... کیونکہ جنگ بڑی ہے۔ اور یہ جنگ ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔ لیکن میں اب خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔‘

گاڑی ٹریفک کے ہجوم میں رینگ رہی تھی۔ ذہن و دماغ میں چلنے والی آندھی ٹھہر گئی تھی۔ اس خاموشی کا خاتمہ رضیہ آپا نے کیا۔

’میں نے اپنی کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔ میں دوبارہ کمپنی جوائن کر رہی ہوں۔‘

میں نے مسکرا کر رضیہ آپا کو مبارکباد دی۔ زندگی کا سفر رکتا نہیں، چلتا رہتا ہے۔ میں کار کے شیشے سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باہر روشنی کا سیلاب اس وقت میری آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔

❑❑❑

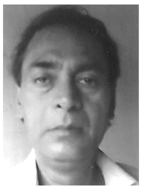

سلیم اختر
436،شیخ سرائے، سیتاپور
موبائل: 7499093303

امید

بھابھی کو دیکھ کر مجھے بھیا کی قسمت پر بے پناہ رشک آتا تھا۔ کتنی خوبصورت تھیں میری بھابھی۔ عین کہاوت کے مطابق لاکھوں میں ایک۔ گورا رنگ، لمبا قد، تیکھا ناک نقشہ، لمبے سیاہ خم دار گیسو، متبسم چہرہ، غزلی آنکھیں، سراحی دار گردن، غرض یہ کہ بس یوں لگتا جیسے سنگ مرمر کی مورتی تراش کر اس میں جان ڈال دی گئی ہو۔ میں نے جب پہلی بار بھابی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی تھی۔ میں تو پہلی نظر میں ہی جان و دل سے فدا ہوگئی تھی۔ بھابھی نے آتے ہی سب کے دل جیت لئے۔ سب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس قدر خوبصورتی کے ساتھ اتنا اچھا اخلاق بہت کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے مگر اوپر والے نے بھابھی کے اندر محبت، مروت، شرافت اور اخلاق سب کچھ فراخ دلی کے ساتھ سمو دیا تھا جو بھی ان سے ملتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی تعریف کرتے نہ تھکتا۔ ماں اور باپو جب رشتہ دار اور محلے والوں سے بہو کی تعریف سنتے تو وہ بھی پھولے نہ سماتے۔ اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔ مگر میرے بھیا بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ انہیں بھی قدرت نے بہت شاندار شخصیت عطا کی تھی۔ جب بھیا بھابھی کسی پارٹی میں جاتے تو سب سے الگ اور نمایاں دکھتے۔ دونوں کی جوڑی بہت ہی اچھی لگتی۔ اگر شادی شدہ جوڑوں کا مقابلہ ہوتا یقینا پہلا انعام میرے بھیا بھابھی کو ہی ملتا۔ دونوں بہت ہی پیار و محبت سے زندگی کی راہ پر گامزن تھے۔

بھابھی کو آئے ہوئے قریب دو برس کا عرصہ ہو چکا ہے۔ ان دو برسوں میں بھابھی کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی جو شادی کے بعد بلا وجہ آتی رہتی ہے۔ آنکھوں میں چمک نہ چہرے پر دمک اور چال میں لچک کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ سب سے ملتیں، بات کرتیں اور خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں۔ بات چیت کے دوران ہنستی اور مسکراتی بھی تھیں مگر جب اکیلی ہوتی تو آنکھوں اور چہرے پر وہ اداسی کے بادل منڈرانے لگتے جب کہ شادی کے بعد لڑکی کے اندر ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کو پُروقار بناتا ہے کیونکہ اب وہ اپنے گھر کی مالکن ہوتی ہے لیکن یہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ بھیا سے کبھی جھگڑا ہوا تھا نہ ممی سے کبھی تو تو میں میں۔ مجھ سے تو بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ پھر کیا وجہ تھی جو بھابھی کو اداس کئے ہوئے تھا۔ میں بھابھی کو اداس دیکھ کر بے چین ہو جاتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں جو بھابھی کی اداسی دور ہو۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی میں انہیں کوئی لطیفہ سناتی یا کچھ ایسا کرتی جس سے بھابھی ہنس پڑتیں، ان کے موتی جیسے دانت چمکنے لگتے۔ کچھ دیر کے لئے ان کی اداسی غائب ہو جاتی، اس وقت بھابھی بہت اچھی لگتیں مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ کبھی کبھی ذہن میں یہ خیال آتا کہ بھابھی کا کہیں کوئی دل کا رشتہ تو نہیں تھا جو انہیں اداس و پریشان کرتا ہے۔ کیا وہ اس گھر میں خوش نہیں ہیں؟ کیوں خوش نہیں ہیں؟ کیا بھیا کے پیار میں کسی طرح کی کوئی کمی تو نہیں؟ پھر میں اپنا ذہن جھٹکتی اور خود سے کہتی، 'کیا بیکار کی باتیں سوچ رہی ہو، ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ تیری خام خیالی ہے۔' طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے اور میں من ہی من ایسی ترکیب سوچتی رہتی جس سے میں بھابھی کی اداسی کا اصلی سبب جان سکوں۔

میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ حالانکہ اکونامکس کے علاوہ اور کوئی مشکل سبجیکٹ نہیں تھا مگر پھر بھی پڑھائی پر دھیان زیادہ تھا۔ بھابھی نے بھی گھر کے تمام کاموں سے بری کر رکھا تھا۔ امتحان نزدیک آرہے تھے۔ کسی دن بھی تاریخ کا اعلان ہوسکتا تھا اس لئے میں پوری لگن اور محنت سے تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ میری تیاری دیکھ کر بھابھی میرا حوصلہ بڑھاتیں۔ رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میرے لئے چائے یا کافی ضرور بناتیں۔ یہ ان کے معمول میں تھا۔ آج جب وہ کافی لے کر آئیں اور کامیابی کی دعائیں دینے لگیں تو اچانک میرے دماغ کی بتی جل اٹھی اور ان کی اداسی کا سبب جاننے کی ایک ترکیب ذہن میں آگئی۔ میں نے کافی کا مگ ہاتھ میں لیتے ہوئے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور ان کو مسکرا کر دیکھنے لگی، بھابھی مجھے مسکراتے دیکھ کر بولیں:

'کیا بات ہے؟'

'کچھ نہیں' میں نے کہا۔ بس ایک بات پوچھنی تھی۔

'کیا؟' بھابھی نے کہا۔

میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور پوچھ لیا۔

'میری کامیابی پر آپ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟'

'جو تم کہوگی' بھابھی نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں نے کہا 'وعدہ' اور میں نے کہا نے وعدہ کر لیا۔ بات ختم ہوگئی۔

امتحان کی تاریخ اور اسکیم آ گئی، میں تیاری میں لگ گئی۔ امتحان کے دن کیسے گزرے، کیسے راتیں گزریں، کچھ نہیں معلوم۔ بہرحال امتحان مکمل ہوا اور میں نے بھی راحت کی سانس لی۔ اوپر والے کے کرم سے پیپر بہت اچھے ہوئے تھے۔ بس اب تو رزلٹ کا انتظار کرنا تھا۔

آج رزلٹ آنے والا تھا۔ صبح سے عجیب حالت تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا۔ انٹرنیٹ پر رزلٹ اپلوڈ ہو چکا تھا۔ میں نے بھی کمپیوٹر آن کیا اور دھڑکتے دل سے اپنا نام اور رول نمبر انٹر کیا۔ چند ہی لمحوں میں رزلٹ میرے سامنے تھا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوئی تھی۔ تقریباً اسی فیصد نمبر آئے تھے۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ممی اور بھابھی نے گلے لگا کر بہت سی دعائیں دے ڈالی۔ بھیا اور پاپا نے فون سے مبارکباد اور دعائیں دیں۔ شام کو بھیا اور پاپا دونوں لوگ مٹھائی لے کر آئے جو گھر کے پاس پڑوس میں بھیجی گئی۔ آج بھابھی نے کھانا بھی میری پسند کا خاص خیال خیال رکھ کے بنایا تھا۔ بھابھی کا یہ انداز بہت پیارا لگا۔

اب مجھے بھابھی سے تحفہ لینا تھا اور مجھے مناسب وقت اور موقع کی تلاش تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر ہم لوگ آرام کرتے تھے۔ پاپا اور بھیا تو باہر ہی ہوتے تھے۔ آج میں نے سوچ لیا تھا کہ بھابھی سے اپنا تحفہ ضرور مانگوں گی لہٰذا دوپہر کے کھانے کے بعد ممی اپنے کمرے میں آ گئیں تو میں نے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے بھابھی کے کمرے کا رخ کیا۔ بھابھی مجھے دیکھ کر بولیں،

'خیریت تو ہے؟'

'ٹھیک ہے۔' میں نے کہا۔ 'کوئی خاص بات نہیں، بات آپ کو کچھ یاد دلانے آئی ہوں۔'

'کیا؟' بھابھی نے کہا۔

'آپ کا وعدہ جو آپ نے کیا تھا۔'

'اوہ! یاد آیا.... بولو.... کیا چاہئے؟' بھابھی نے مسکرا کر پوچھا۔ 'کچھ نہیں، بس مجھے اپنا رازدار بنا لیجئے اور مجھے کچھ نہیں چاہئے' میں نے ہمت کر کے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

'رازدار؟' وہ چونک کر بولیں۔ 'کس بات کا؟'

'ہاں۔ رازدار! اس بات کا جو آپ کو اداس اور بےچین کئے ہوئے ہے۔ مجھے بتایئے آپ کو کون سا غم ہے جو آپ کو ہنسنے نہیں دیتا، جو آپ کے دل و دماغ پر چھایا ہے۔ پلیز بھابھی، پلیز! مجھ سے آپ کی یہ اداسی اب اور نہیں دیکھی جاتی۔' اتنا کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھابھی نے مجھے پیار سے گلے لگایا اور ٹالنے والے لہجے میں بولیں 'ارے کچھ نہیں ہوا ہے، میری صورت ہی ایسی ہے، تم کو وہم ہوا ہے۔' مگر میں ضد پر اڑی رہی۔ آخرکار بھابھی نے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دئے کہ اگر میں نے راز فاش کیا تو میرا مرا منھ دیکھوگی۔

میں نے دل مضبوط کر کے ہاں کر دی۔

بھابھی نے کہنا شروع کیا۔ 'جب میں بارہ تیرا برس کی تھی ایک حادثے کا شکار ہوگئی، ایک جیپ میرے پیٹ کے نچلے حصے کو کچلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ مجھے فوراً ٹراما سینٹر پہنچایا گیا جہاں پر الٹراساؤنڈ ہوا تو پتہ چلا کہ اندرونی چوٹ کافی آئی ہے۔ ہڈی وغیرہ ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کے دوران ہی پتہ چلا کہ آنتوں کے ساتھ وہ حصہ بھی بری طرح متاثر ہو گیا ہے جس میں بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ آنتوں کے خراب حصوں کو کاٹ کر جوڑ دیا گیا مگر 'وہ' حصہ کسی طرح نہیں بچایا جا سکا اور اسے نکال دیا گیا۔ اس سے میری جان تو بچ گئی مگر میں ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی۔ تین چار ماہ ٹھیک ہونے میں لگ گئے۔ پھر دھیرے دھیرے سب معمول پر آ گیا۔ میں پہلے کی طرح پڑھائی میں لگ گئی۔ پڑھائی مکمل کر کے میں سماجی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر سماج کی خاطر ہی شادی کرنی پڑی۔ میں گونگی بنی حیرت سے سب سن رہی تھی۔ بھابھی بولے جا رہی تھیں۔

شادی کی پہلی رات یعنی سہاگ رات میں نے تمہارے بھیا کو گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا، میری کہانی سن کر تمہارے بھیا بالکل خاموش ہو گئے۔ میں ڈر گئی دیکھو کیا ہوتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے مجھے اپنے اس قدر قریب کر لیا کہ میں سب کچھ بھول گئی۔ تمہارے بھیا نے اس بات کو اپنے دل میں دفن کر لیا اور مجھے بھی بالکل چپ رہنے کو کہا۔ واقعی تمہارے بھیا انسان نہیں دیوتا ہیں، میں تو ان کی پجارن بن گئی مگر میں ممی کی طرف سے پریشان ہوں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں پلتی اور جوان ہوتی امید نہیں دیکھی جاتی جو ہر صبح میرے چہرے کو پڑھتیں اور مایوس ہو جاتی ہیں۔ ان کی ہر صبح اسی امید پر ہوتی ہے کہ آج ان کی بہو کوئی خوش خبری سنائے گی یا آج الٹیاں کرتی ہوئی نظر آئے گی یا آج ان کی بہو جھجکتے سے انہیں بتائے گی کہ وہ 'امید' سے ہے۔ ممی اسی امید پر جی رہی ہیں۔ ان کی ہر صبح اسی امید پر ہوتی ہے بس اسی امید پر۔ اتنا کہہ کر بھابھی تو ایک لمبی سانس لے کر یوں خاموش ہوئیں جیسے انہوں نے اپنا سارا بوجھ اتار کر میرے سر پر رکھ دیا ہو۔ میں بے اختیار ہو کر بھابھی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے مجھے ایسے بھینچ رکھا تھا جیسے کسی ماں کا بچھڑا ہوا بچہ اچانک مل گیا ہو۔ میرے دل سے ایک آواز اٹھ کر میرے لبوں پر آئی اور میں نے بھابھی کے کانوں میں سرگوشی کی۔

'آج سے میں آپ کی بیٹی ہوں اور آپ میری ماں ہیں۔ میری بھابھی ماں۔'

جہاں میرا دل بھابھی کے غم میں رو رہا تھا وہیں بھیا کی عظمت کو سلام بھی کر رہا تھا جن کا غم بھی بھابھی سے کم نہیں تھا۔

❑❑❑

رقصاں درخت

عبدالصبور قدوائی

زاہدہ منزل، 4/873، نیوفرینڈس کالونی، علی گڑھ

موبائل: 9457915066

بہت دیر تک کھڑا وہ حیرت سے پیڑ کو تک رہا تھا۔ میں کنویں سے اٹھ کر اس کے قریب گیا، اور اس کو مجذوب قسم کا پایا۔ خط بڑھا ہوا، بال مٹی میں اٹے ہوئے، گریبان چاک، آنکھیں لال جیسے خون کبوتر، اور زیرلب کچھ بڑبڑاتا ہوا۔ انگریزی مثل مشہور ہے کہ سوئے ہوئے کتوں کو مت چھیڑو۔ نوجوانوں کو پند و نصائح کہاں سمجھ میں آتے ہیں۔ میں اس شخص سے مخاطب ہوا، اور صاحبو، وہیں سے میرے آسیب کا قصّہ شروع ہوتا ہے۔

سننے کی تاب ہو تو سنو۔ واقعہ مختصر ہے، لیکن المناک ہے۔ اکثر بڑے بڑے لوگوں کی زندگی اسی فقرے سے عبارت ہوتی ہے: مختصر اور المناک، خواہ وہ عمر بن عبدالعزیز کی ہو یا نپولین کی۔ اس مشت خاک کو کہاں معلوم تھا کہ اس کی زندگی بھی اسی فقرے کی مصداق ہوگی۔ معلوم ہوتا بھی تو کیا، علم نجات کا ضامن تو نہیں۔

تو سنو میرا قصّہ جو مختصر اور المناک ہے۔ کیا؟ میرا نام پوچھتے ہو؟ آپ کے غلاموں کے غلام کو نام زیب نہیں دیتا۔ ویسے بھی، نام تو صرف ایک ہے جو 'لا الہ الا' کے بعد آتا ہے۔

میں اس مجذوب سے مخاطب ہوا، اور پوچھا کہ بڑے میاں، کیا ہوا؟ کیوں یہ حال رچا رکھا ہے؟

اس نے مجھے گھورا، اور یکلخت میری سمت جست لگائی، اور میرے شانوں کو پکڑا، بلکہ جکڑا، اور اپنا غلیظ منہ میرے قریب کیا۔ جب اس نے منہ کھولا، تو بدبو کا ایسا بھپکا آیا جیسے آم کے موسم میں لو۔

وہ مجذوب پیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا: یہ پیڑ اب رقص نہیں کرتا اور اس پر آنے والی بلبل اب گایا نہیں کرتیں۔

یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی گرفت سے چھوڑا اور تیز تیز قدموں سے بیابان کی طرف چل پڑا اور جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

تو صاحبو، یہ تھی میری اس مجذوب سے ملاقات کی روداد۔ جس طرح سے آپ کے روشن چہروں پر حیرت کے آثار ہیں، ٹھیک اسی طرح میں بھی متحیر ہوا تھا۔ میں نے رجوع کیا اپنے کرم فرما اور رفیق ٹخن میاں سے۔ نام غیر مانوس ہے۔ وہ اس علاقے کے نہیں تھے۔ دور کہیں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے کم، قد میں برابر، اور علم و فراست میں مجھ سے کہیں بڑھ کر۔ ان کا ہر جملہ تلمیح ہوتا، اور ہر تلمیح عمیق ہوتی۔ میں سادہ شخص ہوں صاحبو، ان کی تلمیحات تک میری رسائی کہاں۔

ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مکان کے باہر سے آواز دی: ٹخن میاں، ٹخن میاں، اجازت ہے کہ یہ بندۂ حقیر و پر تقصیر آپ کی دہلیز کو سیاہ کرے۔

ٹخن میاں برآمد ہوئے، بغلگیر ہوئے، اور اپنے عالی شان مکان کے چوبی دروازے سے مجھ کو اندر لے گئے، مسند پر بٹھایا۔ خود بعد میں بیٹھے۔ آتش دان میں بھڑکی ہوئی آگ شباب پر تھی، ٹخن میاں نے آگ کے قریب والا مسند مجھ کو دیا۔

بڑے اخلاق والے تھے ٹخن میاں ہمارے۔

انہوں نے ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ کاغذ کی طرف اشارہ کیا، اور بتایا کہ یہاں سے دور، بہت دور، ایک سر بکف کلیم نے ادارہ قائم کیا تھا، اور ٹخن میاں نے اس ادارے کے کتب خانے سے اس دستاویز کو حاصل کر لیا تھا۔ اس میں ذکر تھا ایک قوم کا، اور اس قوم کو درپیش مخمصے کا۔

قوم کون سی تھی، کہاں کی تھی، یہ مجھے یاد نہیں، البتہ مخمصہ ضرور یاد ہے۔ بتاؤں؟

آپ کے اصرار پر بتاتا ہوں۔ دراصل وہ قوم ایک عرصے سے غلام تھی۔ آزادی کا شوق کس کو نہیں ہوتا، ان کو بھی تھا۔ باغیوں میں سے ایک بہت فعال تھا، اور اس نے اپنی قوم کی آزادی کے لئے اپنی ٹانگ کی قربانی دی۔ لیکن افسوس، کہ جسمانی طور پر تو مماثلت آئی، لیکن اس صاحب قراں جیسا عزم اس میں نہ تھا۔ وہ باغیوں سے باغی ہوا، اور حکام کے ساتھ مل بیٹھا۔ دہرا غدار تھا، اور غداری کی حالت میں جنگ آزادی میں مارا گیا۔ حاکموں کے ساتھ اس کو بھی شامل کیا گیا، لیکن جب ایک ٹانگ کی نمایاں کمی سامنے آئی، تو وہ مرد مجاہد یاد آیا جس نے اپنی قوم کے لئے اپنی ٹانگ بہ رضا و رغبت قربان کر دی تھی۔

آزادی مل گئی، اور اب مسئلہ یہ تھا کہ اس شخص کا کس زمرے میں اندراج کیا جائے؟ باغی تو صرف اسکی وہ ٹانگ تھی جو دوران معرکہ شہید ہوئی، خود تو وہ حاکموں سے جا ملا۔

تخجن میاں نے کہا اس مخمصے کو حل کرو، اور وہ ذرا سی دیر میں اندر سے ایک جوڑی فنجان کے ساتھ بر آمد ہوئے جن میں ایک سنہرے رنگ کا مشروب تھا، ایسا کہ باصرہ، شامہ، اور ذائقہ، سب شادکام ہوئے۔ مخمصے کا جواب تجویز کرنا تو درکنار، میں تو بے خود ہو گیا، اور بالآخر تخجن میاں سے التجا کی کہ راز افشاء کریں اور بتائیں کہ قوم نے مخمصے کا کیا حل نکالا۔ وہ مسکرائے، اور ان کے داہنے رخسار میں ہلکا سا بل پڑا، اور پھر یوں فرمایا:

'ضمو، اس شخص کی ٹانگ باغی تھی، لہٰذا صرف ٹانگ کو اعزاز کے لائق سمجھا گیا، اور اس کی یادگار بنائی گئی۔'

آپ پوچھتے ہیں کہ یہ ضمو کون ہے؟ ارے، یہی ننگ زمانہ جس کو آپ نے اپنی توجہ سے مشرف کیا ہے۔ تخجن میاں کو میری حیرت دیکھ کر میرے حال پر ترس آیا، اور انہوں نے تصویر دکھائی جس میں بوٹ میں ملفوف ٹانگ کا سنگی مجسمہ نظر آ رہا تھا۔

میں ششدر تھا، اور مجھے یکا یک وہ مجذوب یاد آیا جس نے مجھ کو اول اول حیرت زدہ کیا تھا، اور میں نے اس کا تذکرہ تخجن میاں سے کیا۔ اغلب ہے کہ تذکرے کے دوران کمرے کی حرارت کی بنا پر مجھے جھپکی سی آ گئی۔ انہوں نے مجھے بیدار کیا، اور تفصیل سے ساری روداد سنی۔

مشروب کا کچھ اثر تھا، کچھ آتش دان کی قربت کا، کچھ مسند کی نرمی کا، اور اس پر مستزاد دن بھر کی حیرت کہ میں ایسا سویا کہ صبح ہونے کے بہت بعد اٹھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ تخجن میاں کا عجب حال ہے۔ وہ اپنی مسند کو چھوڑ چھاڑ کتابوں کے انبار کے قریب بیٹھے ہیں۔ کبھی اس کتاب کو الٹتے ہیں، کبھی اس کتاب کے کچھ اوراق پلٹتے ہیں۔ آتش دان سرد پڑ چکا تھا، اور وہاں سرمئی راکھ کے علاوہ کچھ نہ تھا جہاں رات میں خوب آگ بھڑکی ہوئی تھی۔

میں نے انگڑائی لی، لیکن میری حرکت اور آواز کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں نے ان سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر انہوں نے مطلق دھیان نہ دیا۔

میں دل گرفتہ ان کے عالیشان مکان سے نکلا اور قصبے کے مرکزی بازار کی طرف چلا۔ معقول ناشتہ کیا، کباب اور انڈوں پر مشتمل۔ پچھلا پہر تھا، کرنے کو کچھ نہ تھا۔ میں اپنے مشفق تخجن میاں کے لئے تھوڑا سا ناشتہ لے کر نکلا۔ دروازے کے باہر آواز دی، وہی پرانی صدا کہ تخجن میاں، تخجن میاں، اجازت ہے کہ یہ بندۂ حقیر و پر تقصیر آپ کی دہلیز کو سیاہ کرے۔

لیکن صاحبو!

اس دفعہ جواب ندارد۔ میں نے آواز کو بلند کیا، اور پھر صدا کو دہرایا۔ جواب اب بھی مفقود۔ اتنے برسوں کی رفاقت کے بعد مجھے تخجن میاں کی عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ آج تک میری آواز کا جواب نہ دیا ہو؟ ہرگز نہیں! ہر دفعہ بہت محبت سے استقبال کرتے تھے، اور بڑے اکرام کے ساتھ تواضع کرتے۔ مجھے اندیشہ ہوا۔ میں اسی وقت اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تخجن میاں اسی حال میں ہیں جس میں ان کو میں نے چھوڑا تھا میں نے قریب جا کر ان سے اس جرات کی معافی چاہی کہ میں بغیر اجازت داخل ہوا۔ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا

'لا تثریب علیك الیوم'

میں نے ناشتے کا ذکر کیا۔ اور ان کے چہرے سے لگا کہ وہ بہت پریشان ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آنکھوں میں آنکھ ڈالی، اور کہا زبان یار من ترکی و من نمی ترکی دانم۔ میں گھبرا گیا، اور ناشتہ دان مسند کے پہلو میں رکھ کر الٹے پاؤں نکلا۔

جاتے جاتے انہوں نے فرمایا "اخرج"۔ میں نکل پڑا، اور سورج کی تمازت اور حادثات کی غرابت سے غش کھا کر وہیں گر پڑا۔ جب ذرا دیر میں حواس بحال ہوئے، تو میں پسینے میں تر تھا۔ کمرے کے اندر سے چند فقرے سننے میں آئے۔

نہر تجرید اور عالم ناسوت کے ذکر سے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ میں اس مقام کی طرف دوڑا جہاں مجذوب سے ملا تھا، اور میں جب وہاں پہنچا، تو صاحبو! بلبلوں نے چہک کر خوش آمدید کا پیغام بھیجا، اور بادنسیم کے جھونکے سے ایک پتہ جھڑ کر میرے قدموں پر آ گرا، اور لطف یہ کہ پتہ ابھی سبز تھا۔

میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا، اور سوچا کہ ساری آفت اسی مجذوب کی وجہ سے ہے جس کو لگتا تھا کہ پیڑ اب رقص نہیں کرتا، اور بلبل اب گاتی نہیں ہے۔ میں نے دل میں، اور پھر زبان سے اس پر لعنت بھیجی اور سوچا کہ اس بخت مارے کو قبر نصیب ہی نہ ہو، اور اگر ہو، تو اس میں کیڑے پڑیں۔ پھر تخجن میاں کے خیال میں محو ہو گیا، اور تخجن میاں کے بارے میں سوچتے ہی ان کی شکل آنکھوں کے سامنے ابھر آئی، اور ان کے خد و خال ایسے صاف نظر آئے گو کہ وہ وہیں موجود ہوں۔

سنو صاحبو!

میری حماقت کہ وہ واقعی وہیں تھے، اور مجھ سے یوں گویا ہوئے: 'ضمو! میں تمہارا شکر گزار ہوں!'

اس ناچیز کی اتنی بساط کہاں تھی کہ سمجھتا کہ مدعا کیا ہے۔ قیاس کیا کہ ناشتے کے لئے شکریہ ادا کیا ہوگا۔ کچھ کہنا چاہا کہ اتنے میں وہ متبسم ہوئے، اور کہا نہیں، ناشتے کا معاملہ نہیں۔ اس مجذوب کے تذکرے کے لئے شکر ادا کرنا تھا۔

پھر انہوں نے میرا بازو تھاما، اور میرا چہرہ اس پیڑ کی سمت کیا، اور کہا کہ بتاؤ، یہ پیڑ ساکت ہے کہ ہلتا ہے؟

ابھی میں جواب دینے کی ہمت باندھتا کہ ہاں، یہ تو یقیناً ہلتا ہے، انہوں نے پھر سوال داغا

ضمو، بتاؤ فضا خاموش ہے کہ مترنم؟

اس سے پہلے کہ میں اقرار کرتا کہ بلبل چہچہا رہی ہے، انہوں نے کہا نہیں!

نہ یہ پیڑ ہلتا ہے اور نہ چڑیا گاتی ہے۔ جب تم یہاں آئے، تو تمہارے قدموں میں ایک سبز پتہ گرا تھا، وہ سبز پتہ میں ہی تھا۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کنویں کا پانی نہر تجرید سے آتا ہے، اور جو شخص بھی معرفت حاصل کرتا ہے، لیکن فنا فی اللہ کے لائق نہیں ہوتا ہے، اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ یہ پیڑ ہلنا بند کر دیتا ہے، اور بلبل گانا نہیں گاتی۔ تمہارا مجذوب یہ سمجھ نہیں سکا، اور اسی لئے وہ اپنے حواس سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کل جب تم آئے، تو تمہارے قدموں میں زرد پتہ گرا تھا وہ پتہ وہی مجذوب تھا۔ میرا پتہ سبز ہے کیونکہ میں اس حقیقت کو سمجھ گیا جس کو وہ پا نہ سکا۔

اس کو سمجھنے کے لئے وہ کتابیں درکار ہیں جو میرے کتب خانے میں ہیں۔ میں ان کو آتش دان میں ڈال آیا ہوں، راکھ کے نیچے ایک انگارہ ہے، وہ پرانے کاغذ کو خاکستر کر دیگا۔ جاؤ، اور جلدی پڑھ لو۔

میں دوڑتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا، اور آنکھ بند کر کے ان کاغذات کو آتش دان سے نکالا۔ راکھ کے اڑنے سے مجھے چھینک آ گئی، اور اس کے بعد قدرتا آنکھ کھل گئی۔ نظر ایک صفحے پر پڑ گئی، اور با دل نا خواستہ، بلکہ مجذوبانہ میں نے اس صفحے کو پڑھا، اور پھر پورے انبار کو مسند پر رکھ دیا۔ واپس اسی پیڑ کی طرف آیا۔ دیکھا کہ خجن میاں اس کو تک رہے ہیں۔

میں نے آواز دی، اور انکی طرف مخاطب ہوا۔ انہوں نے سر تک نہ ہلایا، میں قریب پہنچا، اور میں نے سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں نمی دانم چہ منزل بود شب جائے۔ انکو جھنجھوڑا، اور ان کے کان میں چلایا:

خجن میاں!

ارے او خجن میاں!

وہ میری طرف متوجہ ہوئے، اور قدرے اطمینان سے پوچھا کہ یہ درخت رقصاں کیوں نہیں ہے، اور تمام طیور منقار زیر پر کیوں ہیں؟

پھر جیسے انکو کچھ یاد آیا ہو، اور انہوں نے جھرجھری لی، اور پھر یوں گویا ہوئے:

ضمو! میں تیر بے ہدف ہو گیا ہوں، میں جاتا ہوں۔ تم اپنی ذمہ داری پوری کرو، اور یہ جا وہ جا، خجن میاں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔

اے صاحبو!

میں تاسف سے دیکھتا ہوں کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور آپ کے قدم خجن میاں کے مکان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آہ! یہ دیکھئے۔ چند زرد پتے اور ٹوٹ کر پتوں کے اس انبار میں شامل ہو گئے ہیں جو پہلے سے میرے قدموں میں ہے۔ اس انبار میں صرف خجن میاں کا پتہ سبز ہے۔ باقی سب زرد ہیں۔

الم کشو!

اٹھو، کہ اور راہ گیر آتے ہیں، اور مجھے اپنی ذمہ داری پھر سے نبھانی ہے۔

❑❑❑

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ دوم)

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر **نعمان قیصر** اور فارسی ادب میں ہندو شعراء کی خدمات پر **ڈاکٹر سعدیہ جعفری**، کملیشور کی ادبی خدمات پر **مشرف عالم ذوقی** اور بلونت سنگھ کے فن پر **رضوان انصاری**، تصوف اور ہندوستانی روحانیت پر **ڈاکٹر نریش** اور اردو کے غیر مسلم شعراء کی شاعری میں اسلامی اثرات پر **رضیہ پروین** کے مضامین

گلزار دہلوی، رتن سنگھ، چندر بھان خیال، دیپک بدکی، راجیو پرکاش ساحر، وشال کھلر، خوشبیر سنگھ شاد، پونم کوثر، رینو بہل، منیش شکلا، نلنی وبھا نازلی، سیا سچدیو، رام پرکاش بیخود، پی پی شریواستو رند، اویناش امن، رمیش پانڈے سُکھر، دیپک نشاط وغیرہ کی تخلیقات، ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر مشمولات

اگست ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' اردو زبان کے انہیں اوصاف پر مبنی ہوگا

پورے چاند کی رات

گل جبین اختر

اسسٹنٹ پروفیسر، لال بہادر شاستری پی جی کالج، مغل سرائے

ضلع چندولی موبائل: 9450907747

بیٹی کی شادی کے ہنگاموں میں سنتو نے اپنی ذات کو پوری طرح بھلا دیا تھا۔ شلوار کی پھٹی ہوئی موہری پیروں میں پھنس پھنس کر اسے بدلنے کو کہتی مگر اسکا دھیان ہی نہیں جاتا، دوپٹے میں کئی جگہ چولہے کی کالخ لگ گئی تھی اور اسی دوپٹے سے بار بار چہرہ صاف کر کے اس کالخ کو اسنے اپنے چہرے کی رونق بنا لی تھی مگر اسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی، بال تو اسنے کئی روز سے نہیں باندھا تھا، نہانے کے بعد سوکھنے کے لئے کھلے چھوڑ دیا پھر انھیں باندھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وہ اسی طرح پورا دن باقی کے کاموں میں الجھی رہتی۔ مشکل تو تب پیش آئی جب دولہا کی طرف سے کچھ لوگوں نے اسے دلہن کی ماں کے بجائے گھر کی دائی سمجھ لیا اور پھر اس بات پر اسکا بہت مزاق بنایا گیا۔

جب سے لاجی کے بابو جی کا انتقال ہوا تھا بیٹی کی ساری زمہ داری سنتو کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ عین جوانی میں شوہر کا ایک بیٹی کو گود میں ڈال کر ساتھ چھوڑ جانے کا درد اسنے اپنی چھاتی پر جھیلا تھا مگر بیٹی کو کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ پنڈ والوں کی مخالفت کے باوجود اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم دی، اچھی پرورش کی اور شادی کی تیاری تو تب سے شروع کر دی تھی جس دن لاجی پہلی بار اسکی گود میں آئی تھی۔ اسکے جہیز کا سارا سامان، کپڑے لتے پھر ان پر زری گوٹا لگا کر بیل بوٹے کاڑھنے تک کا سارا کام اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔

آج لاجی کی مہندی کا دن تھا اور ایسے میں اسے خود کے ساج سنگار کی فرست کہاں تھی پھر ابھی تو پھلکاری پر ٹیکی لگانا باقی تھا۔ باہر ناچ گانے کے ہنگامے چل رہے تھے اور اندر کمرے میں بیٹی کی چنّی اور پھلکاری میں لگی ٹیکی کی جھلملاہٹ میں وہ اپنے سونے بچپن کی یادوں میں کھوئی تھی۔

چھٹپن سے اسے یہ گوٹا کناری لگے ہوئے دوپٹے اوڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کلائیوں تک بھر بھر کر چوڑیاں، لالی، ناخن پالش غرض وہ سب کچھ جو باقی لڑکیاں کرتی تھیں اسکا دل بھی یہ سب کرنا چاہتا تھا مگر بابو جی کی نظر میں شادی سے پہلے یہ ساج سنگار شریف خاندان کی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے۔ سنتو جب اس طرح سجی سنوری لڑکیوں کو دیکھتی تو اسکا دل مچل اٹھتا، مہندی سے سجے خوبصورت ہاتھ اسکا من موہ لیتے اگر اسکو ان سب کی اجازت نہیں تھی اور بابو جی کی اس دادا گیری کے آگے سنتو کی ماں کی زبان بھی گنگ رہ جاتی۔ ایک بار تو اس نے چھپ کر مہندی کا تیل بنایا مگر نہ جانے کہاں سے بابو جی کی نظر پڑ گئی اور انھوں نے سارا مہندی کا تیل پانی میں بہا دیا۔ کتنی دیر وہ روتی رہی اپنی خواہشوں اور محنت کو اس طرح پانی میں بہتا ہوا دیکھ کر اور اس دن سے مہندی لگانی چھوڑ دی تھی مگر آج تو اسکی بیٹی کی مہندی تھی جس میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

ارے یہ سنتو کہاں گئی بیٹی کی شادی میں ماں عید کا چاند ہو گئی ہے کیا؟" باہر کسی نے اسکا نام لیکر آواز لگائی۔ یہ شائد گرداس پور والی مائی کی آواز تھی۔

ارے تو یہاں بیٹھی ہے سنتو، دیکھ باہر سمدھیانے سے لوگ آئے ہیں بیٹی کے سہاگ کا جوڑا لیکر" مائی اسے ڈھونڈتے ہوئے اسکے کمرے تک آ گئی۔

'ہاں مائی بس آتی ہوں۔' اسنے جلدی جلدی سوئی کا دھاگا دانتوں سے کاٹ کر ڈبے میں رکھا اور مائی کے پیچھے پیچھے چل دی۔

ارے ایسے ہی جائیگی سمدھیانے والوں کے سامنے، زرا شکل دیکھ آئینے میں، کپڑے بدل لے، بال ٹھیک کر پھر آنا، جب تک میں انکے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں" مائی اسکو ہدایتیں دیکر چلی گئی۔

آئینہ؟

آئینہ تو اسنے کب سے نہیں دیکھا، اپنے وجود کو یادوں کے کہرے میں لپیٹے ہوئے جب وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو سامنے ماضی کے جھروکے میں اسے ۱۶ سالہ سنتو نظر آئی، شرمائی لجائی بال بناتی ہوئی۔ پڑوس کے چاچا کے یہاں دور کا رشتے دار شہر سے آیا تھا، گہری گہری آنکھوں والا، اتھاہ سمندر سے بھی زیادہ گہری، کچھ بات تھی ان سنجیدہ آنکھوں میں جو دل بے قرار ہوا جا رہا تھا، آتے ہی اسنے اسکی چوٹی پکڑ کر گھسیٹا تھا، سارے بال کھول دئے تھے جو اسکی کمر کے نیچے تک آتے تھے اور دیر تک اسکے بالوں کی تعریف کرتا رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اسکی اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔ جذبات تھے کہ بیان ہونا چاہتے تھے، اکثر آئینہ کے سامنے کھڑے کھڑے مسکراتی، کئی کئی بار چوٹی کھولتی، پھر بناتی پھر آئینہ سے ہی شرما کر پرے ہٹ جاتی، مگر ایک دن اس لکا چھپی کے کھیل میں وہ پکڑی گئی۔ بی بی کی نظر کیا پڑی کہ کہانی کو داستان بننے میں دیر نہ لگی اور اس افسانے کا انجام پہلے ہی لکھ

دیا جسکا آغاز بھی ابھی ٹھیک طرح سے نہیں ہوا تھا، کمر سے نیچے جھولتے بال آنکھوں کی کرکری بن گئے۔

دیکھ سنتو کی ماں، بیٹی جب آئینے سے باتیں کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جوان ہوگئی ہے اور جوان بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے" بی بی نے مشورہ کیا دیا کہ بابو جی کا تو حکم ہی صادر ہوگیا، ماں بیچاری تو ابھی تک آنکھ بھر کے دیکھ بھی نہیں پائی تھی بیٹی کو جوان ہوتے ہوئے مگر میاں کے سامنے کچھ کہہ پانے کی مجال اس میں نہیں تھی۔

کب تک آئینہ دیکھتی رہوگی سنتو، بیٹی کی شادی ہے تیری نہیں"۔ پیچھے سے آئی آواز نے اسے چونکا دیا، خوشی کی بُوا سمدھیانے سے آئی مٹھائی کی تھال لیئے کھڑی تھی۔

'اسے کہاں رکھوں' نند نے مسکراتے ہوئے پوچھا

'اسے مجھے دے رجّو میں رسوڑے میں رکھ دیتی ہوں'۔ سنتو نے تھال اپنی نند کے ہاتھ سے لے لیا۔

اچھا سن سنتو وہ لوگ اپنی لاجی کو مہندی لگانے آئے ہیں، تو جلدی سے نیچے آجا، ایسے موقع پر ماں کا رہنا ضروری ہوتا ہے" بڑی نند نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔

نہیں رجّو میں نہ آؤنگی، جی ڈرتا ہے میرا کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے میری بیٹی کو" سنتو نہیں چاہتی تھی کہ اسکی بیٹی کی آنے والی والی خوشیوں پر اسکی گزری زندگی کے اندھیروں کا سایہ بھی پڑے اس لئے وہ کسی بھی رسم میں سامنے نہیں جاتی۔

ماں کی نظر لگتی ہے کہیں بیٹی کو، کیسی باولوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ ڈر مت اور میرے ساتھ چل" بُوا نے اسکے شانوں کو دباتے ہوئے اسکو وسوسوں سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔

'ٹھیک ہے تم چلو میں کپڑے بدل کر آتی ہوں'

نیچے کا ماحول اسکے دل کے حالات سے بالکل الگ تھا، ایک طرف سارے پنڈ کی عورتیں گول بنائے مہندی کے گانے گا رہی تھیں اور لڑکیاں ناچ رہی تھیں تو دوسری طرف سمٹی ہوئی خوشی دونوں ہاتھ پھیلائے مہندی کے بوٹے بنوا رہی تھی، جس پر اسکی سہیلیاں طرح طرح سے چھیڑ رہی تھیں۔

ارے دیکھ نہ کتنی رچ گئی ہے ہماری بنو کی مہندی، دولہا بہت چاہیگا تجھے لاجی" کسی نے مزید چٹکی لیتے ہوئے اسکو چھیڑا اور وہ کسمسا کر اپنی بُوا کے بازوؤں میں سمٹ گئی،

ارے کیوں نہ ہو، ہماری لاجی ہے ہی اتنی پیاری" بُوا نے بھتیجی کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

آدھی سے زیادہ رات اسی طرح مہندی کے ہنگاموں کی نظر ہوگئی۔ پاس کے مہمان کھانا کھا کر اپنے اپنے گھر سونے چلے گئے۔ دور سے آئے رشتے داروں کے لئے آنگن میں بستر لگا دئے گئے تھے، مردوں کا انتظام باہر صحن میں کیا گیا تھا اور جنانیوں کے لئے بروٹھے میں زمین پر پوال بچھا کر بستر لگا دیا تھا مگر ان میں سونا کس کو تھا، آپس میں ہنسی مزاق تو کبھی لاجی سے چھیڑ چھاڑ کی آوازیں سرگوشیوں میں ابھر رہی تھیں مگر سنتو ان سب سے الگ بیٹی کی آنے والی زندگی کی خوشیوں کے لئے خواب بن رہی تھی اور تھک کر چور سنتو جب اپنے بستر پر پہنچی تو سسرال سے آیا بیٹی کا شادی کا جوڑا اور سہاگ کی چوڑیاں اسکے بستر پر پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ دلہنیں بھی کتنا رعب دکھاتی ہیں، ایک کام خود نہیں کرسکتیں' بناوٹی غصے کا اظہار کرتے ہوئے سنتو نے بڑبڑاتے ہوئے کپڑے سمیٹنا شروع کیا،

ہاں مگر خوشی ابھی بچّی ہی تو ہے، اپنی چیزیں سمبھال کے رکھنا اسے آتا ہی کب ہے" خود کو تسلی دینا اسے بخوبی آتا تھا مگر یہ سب کر کے اسے بہت خوشی مل رہی تھی۔ یہ ہی تو خواب دیکھے تھے اسنے بیٹی کے لئے جو اسے نہیں ملے اور نا ہی کسی نے اس طرح اسکے نخرے اٹھائے سوائے ماں کے جو خود بے بس تھی، پھر سے نا جانے ۱۶ سالہ سنتو کہاں سے سامنے آگئی،

سنتو اری او سنتو، دیکھ تیری سسرال سے شادی کا جوڑا آیا ہے زرا پہن کے دکھا، میں بھی تو دیکھوں کیسی لگے گی میری سنتو اس میں، اور یہ چوڑیاں بھی پہن کے دیکھ لے کہیں چھوٹی بڑی نہ ہوں" ماں نے باہر سے آواز لگائی۔

شادی کا جوڑا، کسی اور کے نام کا، مگر وہ تو اپنے شہری کے نام کا جوڑا کب کا پہن چکی تھی اب تو محض رسم نبھانی تھی، دونوں جس بندھن میں بندھ چکے تھے وہ ان رسموں سے پرے تھا جسے کسی سند کی ضرورت نہیں تھی۔ بی بی کی بیماری کا حوالہ دیکر چٹ پٹ اسکی شادی یوں طئے کردی گئی مانو وہ چندروز کی مہمان ہیں مگر شادی کے اگلے ہی دن ایسے نظر آرہی تھیں جیسے کبھی کھانسی زکام تک چھو کر نا گزرا ہو، رودھو کر دیکھ لیا مگر بابو جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

دیکھ سنتو، گاؤں کے باہر والی باوڑی کے پاس جو گل موہر کا پیڑ ہے میں رات کو وہاں تیرا انتظار کروں گا۔ مجھے بھروسہ ہے کہ تو ضرور آئیگی"

اسنے اپنے پیار کا مان دیتے ہوئے سہاگ کی چوڑیاں حوالے کی تھیں اسکے اور وداع کیا تھا رات تک کے لئے اسے بہت سے خواب اور امیدوں کے ساتھ۔

پہن نہ سنتو، دیکھ کتنا خوبصورت جوڑا آیا ہے تیری سسرال سے" ماں نے بانہوں میں لیتے ہوئے اسے خیالوں سے باہر نکالا۔

اوہ ماں، ایک لمبی سانس لیتے ہوئے سنتو ماں سے لپٹ گئی اور شائد آخری بار وہ اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں پر رو رہی تھی، نا جانے کتنی دیر تک دونوں ماں بیٹی آنسوؤں میں اپنے اپنے غم دھوتی رہیں۔ اگلے دن اسی جوڑے میں جب سنتو ماں کے سامنے آئی تو ماں نے نظریں جھکالیں کہ کہیں بیٹی کو اسکی نظر نہ لگ جائے، یہ نظر لگنے کے معاملے بھی کچھ کم دھوکے میں نہیں رکھتے، بیٹی روتی رہی اور عقب سے آوازیں آتی رہیں۔

بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی
بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا
بنو تیرے جھومر کی لڑیاں ٹوٹیں
بنو میں موتی چنتا آیا
بنو تیرے سحرے کی لڑ جو ٹوٹی
بنو میں کلیاں چنتا آیا
بنو تیرے جھمکے کی نتھ تے جھووٹے
بنو میں سچے موتی لایا...

ارے واہ ماں یہ چنری تو تم پر خوب سج رہی ہے پیچھے سے لاجی کی آواز اسکے خوابوں کو چیرتی ہوئی اسے خیالوں سے باہر نکال لائی،

ویسے ماں جب تم دلہن بنی ہوگی تو نا جانے کتنوں کے دل گھائل ہوئے ہونگے“ اسنے ماں کو چھیڑتے ہوئے اسکے گلے میں بانہیں ڈال دیں، انجانے میں بیٹی کی یہ بات سنتو کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، دل تو ٹوٹے تھے مگر صرف ہم دو لوگوں کے،

کیسی باتیں کرتی ہے ماں سے شرم نہیں آتی، ہٹ پرے“ یہ کہکر سنتو نے بیٹی کو ٹال تو دیا مگر ماضی کا ایک ورق ضرور کھل گیا۔

ارے ارے مت اتارو میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ میری ماں شادی کے لباس“ اسنے پھر سے وہ دوپٹہ ماں کے سر پر ڈال دیا جو اسنے بے خیالی میں اپنے سر پر ڈال لیا تھا،

یہ تو کیا کر رہی ہے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا، بیٹی کی شادی میں ماں کا دماغ پھر گیا ہے“ سنتو ہڑبڑاتے ہوئے دوپٹہ اتار کر تہانے لگی،

کوئی کچھ نہیں کہے گا ماں، تو یہاں بیٹھ، یوں بھی ہمارے سوا یہاں پر کوئی نہیں ہے،“ ماں کو خاموش کر کے اسکا ہاتھ پکڑ کر اسنے ایک ایک کر کے ساری چوڑیاں اسکی کلائی میں ڈال دیں، جھمکے، ہار، ٹیکا غرض سب کچھ اسی طرح جیسے دلہن بناتے وقت اسکی ماں نے اسے پہنایا تھا،

ہائے میں واری جاواں، نظریں تو اٹھا کر دیکھ آئینہ میں ماں، تو کتنی خوبصورت لگ رہی ہے“ لاجی نے ٹھوڑی پکڑ کر اسکا چہرا آئینہ کے سامنے کر دیا اور اسکی لمبی چوٹی سے کھیلنے لگی،

یہ آئینہ بھی کتنا جھوٹ بولتا ہے، آج کچھ کہہ رہا ہے کل کچھ کہہ رہا تھا جب ماں نے آئینے کے سامنے لے جا کر اسکی تعریف کی تھی سوچتے ہوئے اسنے نظریں جھکا لیں اور ایک ایک کر کے چوڑیاں اتارنے لگی،

مت اتار ماں، آج تو ایسے ہی چوڑیوں بھری کلائیوں سے میرے بالوں کو سہلا، اور میں آخری بار تیری بانہوں میں سکون سے سو سکوں“ اور اسنے اپنا سر سنتو کی گود میں ڈال دیا۔ بیٹی کے سامنے سنتو نے ہار مان لی، کبھی وہ ان چوڑیوں کو دیکھتی کبھی انکی چھنچھناہٹ میں کھو جاتی، آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے میں اتنی کمزور کیوں پڑ رہی ہوں اسنے جلدی سے سوئی ہوئی بیٹی کو اسکے بستر پر لٹایا اور آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی،

کیا سچ میں آج بھی میں خوبصورت دکھتی ہوں؟

کیا آج بھی میرے بال اسے یاد ہونگے؟

کیا آج بھی گل موہر کے نیچے وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا؟ اس نے خود سے سوالوں کی جھڑی لگا دی،

آئینہ کے سامنے کھڑی سولہ سال والی سنتو اسی طرح شرما کر سامنے سے ہٹ گئی اور پیچھے سے شہری اسکی چوٹی کھولتا ہوا سامنے آ گیا،

تیرے بال آج بھی بہت خوبصورت ہیں اور دھیرے دھیرے اسنے خود ہی اسکی بال کھول دئے،

مجھ پر بھروسہ ہے تو ایک بار آ جا، میں ہمیشہ سے تیرا انتظار کر رہا ہوں سنتو۔ اور ہاں پگڈنڈیوں پر ذرا سمبھل کر پاوں رکھنا مٹی بہت چکنی ہے پاوں پھسل جائیگا۔ آئینہ میں آج بھی وہی سوہنا تھا جو بچوں کی طرح ضد کر رہا تھا۔

آج پھر وہی دل تھا جو کسی طرح کی پابندیاں نہیں چاہتا تھا، وہی جذبات تھے جو کبھی بہکنا چاہتے تھے۔

مت روک آج خود کو! وعدہ نبھا لینے دے، بے لگام چھوڑ دے آج ان خواہشوں کو جن پر برسوں سے پہرے لگائے بیٹھی ہے تو،

قدم تھے کہ ان ہی پگڈنڈیوں پر چل پڑے، سامنے اسکا رانجھا اسکے انتظار میں کھڑا تھا سالوں سے، صدیوں سے، سب کچھ ویسا ہی تھا اور ویسی ہی تھی وہ پورے چاند کی رات، جب چاندنی نے گزرے سالوں کے فاصلوں کو دھو دیا تھا

تو کیوں نہیں آئی سنتو، کیا بھروسہ کم پڑ گیا تھا یا میری محبت، کتنی راتیں میں نے پلکوں میں گزار دیں“ ایک شکایت اسکے کانوں میں گونجی،

کوئی شکوہ شکایت نہ کر اور اگر کچھ کر سکتا ہے تو وقت کو روک دے اور کچھ لینے دے جی بھر کے آج“ سنتو کا بس چلتا تو وہ رات کو کہیں قید کر دیتی،

تو کتنی خوبصورت ہے سنتو اور تیرے لمبے بال بالکل ویسے ہی، آزاد کر دے انھیں ہر قید سے اور کھیلنے دے مجھے ان سے۔

جلدی ہی ٹمٹماتے تاروں نے چھپنا شروع کر دیا، اس سے پہلے کہ کسی کی نظر اس پر پڑ جائے، سنتو نے جلدی سے خود کو سمبھالا، کپڑوں پر لگی مٹی جھاڑی اور چنّی سر پر ڈال کر کھیتوں کے کنارے بنی پگڈنڈیوں سے لگ کر چلنے لگی، صبح ہونے کو ہے اسے جلدی جلدی قدم بڑھانا چاہئے یہ سوچ کر اسنے رفتار اور تیز کر دی،

اسی درمیان پیچھے سے ایک سائے نے آواز لگائی،

کون ہے؟

اسنے بغیر پیچھے مڑے چال اور تیز کر دی، ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی، اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، قدموں کی رفتار نے تیزی پکڑ لی، چنّی جھاڑیوں میں کہیں الجھ گئی اور بار بار گھسیٹنے پر بھی الجھی چنّی ہاتھ نہ آئی مجبوراً اسے وہیں چھوڑ کر وہ تیز تیز قدموں سے چکنی مٹّی پر پھسلتی رپٹتی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

دروازے کے اندر قدم رکھنے کے بعد ہی اسکی سانس میں سانس آئی، صحن میں مرد ابھی سو رہے تھے، جنانیاں بھی الٹے سیدھے اسکا پاؤں اسکا سر دھرے پڑی تھیں، ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتی ہوئی وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچی جہاں لاجی آنے والی زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی، جلدی سے اسنے کپڑے بدلے، سب کچھ اسی طرح اپنی اپنی جگہ پہنچادیا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا اور بغیر ایک لمحہ گنوائے وہ اپنے بستر پر بے سدھ گر گئی جیسے میلوں کی مسافت کے بعد مسافر تھکا ہارا اپنے گھر پہنچا، ہو بستر پر جاتے ہی اسکی آنکھ لگ گئی،

اری سنتو اٹھ، دیکھ باہر لاجی کی سرال سے کچھ لوگ آئے ہے" کسی نے جھنجھوڑ کر اسے خوابوں سے جگایا۔

کیا ہوا مائی یہ باہر شور کیسا ہے" سنتو نے ہڑبڑاتے ہوئے دوپٹا سمبھالا اور چارپائی سے اٹھکر کھڑی ہوگئی،

تو خود باہر آکر دیکھ لے"

سنتو بھاگتے ہوئے مائی کے پیچھے پیچھے صحن میں پہنچی جہاں سے تیز تیز آوازیں آرہی تھیں، کچھ مرد آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے تو کچھ لوگوں کے چیکھنے چلانے کی آوازیں باہر تک جارہی تھیں۔ لاجی کہاں تھی، بیٹی کا خیال آتے ہی اسکی نگاہوں نے اسکو تلاش کرنا شروع کر دیا، جو کنویں کی منڈیر کے پاس کھڑی تھی۔

آؤ سنتو، تمھارا ہی انتظار تھا" لاجی کے ہونے والے سسر نے ایک تیز ہانک لگائی

کیا ہوا دار جی" سنتو کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیا ہوئی ہے،

کیا بیٹی پیدا کی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ بات کیا ہے کیا تجھے میرا ہی گھر ملا تھا برباد کرنے کے لئے سنتو" انھوں نے سنتو کو دیکھتے ہی بڑبڑانا شروع کر دیا

کیا کہہ رہے ہو آپ، ہوا کیا ہے؟" سنتو نے چارپائی بچھا کر انکی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بھولے پن سے سوال کیا،

یہ ہم سے پوچھ رہی ہو کہ کیا ہوا ذرا اپنی بیٹی سے پوچھو جو سارے پنڈ کے نام پر کالخ لگا کر آئی ہے" بیٹھنے سے انکار کر کے کھڑے کھڑے ہی انھوں نے اپنی بات جاری رکھی،

مگر کیا کیا ہے میری بیٹی نے؟"

تیری بیٹی ایک آوارہ ہے" خوشی کے ہونے والے سسر نے ہنکار لگائی جسے سنکر وہاں موجود سبھی لوگوں کے ہوش اڑ گئے،

زبان پر لگام دو، لاجی ہماری بیٹی ہے اور اسے ہم لوگ تم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں، ویسے کیا کیا ہے لاجی نے جو آپ اتنا بڑا الزام اس پر لگا رہے ہیں؟" مائی نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے پوچھا

بڑی بی اپنی بیٹی سے پوچھو کہ رات کیسی گزری کھیتوں میں؟

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بیٹی پر لگام لگاؤ، اتنا آزاد نہ چھوڑو کہ ایک دن سمبھالنا ہی مشکل ہو جائے، ملا دیا نام خاندان کا مٹی میں، ہوگئی نا ساری پڑھائی لکھائی دھری کی دھری" سسر نے اپنا سارا زہر اگل دیا۔

یہ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ، صاف صاف بات بتائے کہ ہوا کیا ہے، ایک بن باپ کی بچی پر اس طرح کیچڑ اچھالنا کہاں کی شرافت ہے" سنتو نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا

اری ادھر کیا کھڑی ہے لاجی! ادھر آکر بتا کہ کل دیر رات اس گل موہر کے پیڑ کے نیچے کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی"

اتنا سنتے ہی سنتو کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی، جسم کا سارا خون جم گیا

یہ آپ کیا کہہ رہے ہو دار جی" سنتو نے دبی آواز میں کہا

سنو پنڈ والوں، صبح تڑکے میں کھیتوں میں پانی دینے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سایا لہرا رہا ہے، میں نے پیچھا کیا تو دیکھا کہ سائے دو ہو گئے، پھر میں نے آواز لگائی تو ایک سرسراہٹ ہوئی اور کوئی دبے پاؤں بھاگا، میں نے پیچھا کیا تو اس سائے نے دوڑ لگا دی، میں بھی پیچھے ہولیا مگر کچھ ہی دیر میں سایا آنکھوں سے اوجھل گیا، میں واپس ہونے ہی والا تھا کہ مجھے کانٹوں میں الجھی ایک چنّی نظر آئی، کیوں سنتو یہ وہی چنّی نہیں ہے جو کل تیری بیٹی کی سسرال سے آئی تھی؟ خوشی کے ہونے والے سسر نے چنّی ہوا میں اچھال دی جو سیدھے سنتو کے اوپر گری اور سنتو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چنّی کو دیکھنے لگی

آگے سنو بڑی بی پھر میں نے دوسرے ایک مردانے سائے کو گاؤں کے باہر کی طرف جاتے ہوئے، پھر جب میں گل موہر کے پیڑ کے نیچے آیا تو یہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ملی، کہہ دے کہ یہ چوڑیاں تیری نہیں لاجی" یہ کہکر انھوں نے چوڑیوں کے ٹکڑے سب کے سامنے بکھیر دئے

کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا بس مائی نے آگے بڑھ کر ان چوڑیوں کے ٹکڑے سمیٹ کر سنتو کی جھولی میں لاکر ڈال دیا اور اسکی سہمی آنکھوں میں موجود خوف کو پڑھنے لگی،

خاموش کیوں ہو سنتو، کچھ بولو، بڑا گھمنڈ تھا بیٹی پر ناک کٹوا آئی کھیتوں میں، اب کون بیاہے گا تیری اس آوارہ بیٹی کو"

سارے لوگوں کی نگاہیں لاجی کو گھور رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں کی مہندی کو، جس میں وہ اپنی ماں کے ادھورے خوابوں کے رنگ تلاش کر رہی تھی۔۔

شادی والے گھر میں ماتم چھا گیا، سنتو دروازے پر لوگوں کے جانے کا سلسلہ دیکھتی رہی اور پیچھے سے بیٹی کہیں دور چلی گئی صرف فضا میں ماں کی آواز ابھری اور کہیں دور کھو گئی۔

❑❑❑

ادھورا خواب

محمد قمر سلیم
انجمن اسلام اکبر پیر بھائی کالج، واشی، نوی ممبئی
موبائل: 9322645061

لِٹویا کے شہر رِگا میں سات ستارہ ہوٹل شیرٹن یوں تو ہمیشہ ہی پر نور رہتا ہے لیکن آج اس کی رونق کچھ الگ ہی سماں پیش کر رہی تھی۔ ہوٹل شیرٹن کی بلند وخوبصورت عمارت ساحل کے کنارے کھڑی تھی۔ عمارت کے ایک طرف سمندر تھا، دوسری طرف خوبصورت پہاڑیاں اور ان میں سے بہتے ہوئے آبشار تھے۔ دور تک ہریالی نے ایک مخملی چادر بچھا رکھی تھی۔ ہوٹل میں جو ایک بار آجاتا تھا اس کا یہاں سے جانے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر وقت ہوٹل کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ اس ہوٹل میں چار کشادہ اور بے پناہ خوبصورت ہال تھے۔ دنیا کے کونے کونے سے بڑے بڑے سرکاری، غیر سرکاری اداروں، کارپوریٹ ورلڈ کی تقریبات اس ہوٹل میں ہوتی تھیں۔ یہاں کوئی بھی تقریب کرنے کے لیے مہینوں پہلے ہال بک کرنا پڑتا تھا۔ اس ہوٹل کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہر تقریب وقت پر شروع ہوتی تھی اور متعینہ وقت پر ختم بھی ہو جاتی تھی۔ تقریب شروع ہوتے ہی ہال کے تمام گیٹ بند کر دیے جاتے تھے اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ کتنی بار تو معزز ہستیوں تک کو لوٹ جانا پڑا۔

آج بھی ہوٹل کے شَیم راک ہال میں ایک پر وقار تقریب کا انعقاد ہونے جا رہا تھا۔ آج ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کی تقسیمِ انعامات کی تقریب تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا اور پر وقار ایوارڈ پلیٹنم ہیلتھ ایوارڈ ہندوستان کے مشہور و معروف عظیم ڈاکٹر پرتھمیش گھوش کو ان کی ۳۵ سالہ انسانی خدمات کے عیوض میں دیا جانا تا تھا۔ پروگرام ٹھیک سات بجے شروع ہونا تھا۔ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ سیاسی، سماجی، فلمی ہستیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور لٹویا کی معزز ہستیاں ہال کے داہنی طرف بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ بائیں جانب پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا گیلری تھی۔ سات بجنے میں دس منٹ تھے۔ سب کی نگاہیں اسٹیج پر تھیں۔ تبھی ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کے صدر تھامس اسمتھ اور سکریٹری سَیٹرک گوندالوؤ داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ڈاکٹر پرتھمیش گھوش اپنے والد شری مَتیش گھوش کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔

پروگرام ٹھیک سات بجے شروع ہو گیا۔ تقسیمِ انعامات سے پہلے ہلکا پھلکا ثقافتی پروگرام ہوا۔ پھر معزز ہستیوں کو مختلف فنونِ طب میں ان کی کارکردگی کے لیے انعامات دیے گئے۔ اینکر رابرٹ نے بہت پر جوش انداز میں اعلان کیا،

''اور اب اس شام کا سب سے بڑا انعام پلیٹنم ہیلتھ ایوارڈ ڈاکٹر پرتھمیش گھوش کو دیا جائے گا۔ ڈاکٹر گھوش کو یہ ایوارڈ ان کی ۳۵ سالہ خدمات کے لیے دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر گھوش نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے ساتھ ہی شہر میں رہنے کے بجائے گاؤں میں اپنا بسیرا کیا۔ انھوں نے اپنے پروجیکٹ 'میرا گاؤں، میرا دواخانہ' کے تحت ہندوستان کے ہر گاؤں میں دواخانے کھولے۔ آج ان کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی ہے اور لاکھوں لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان دواخانوں میں علاج مفت ہوتا ہے۔ ان میں ہر طرح کی سہولتیں دستیاب ہیں اور یہاں ڈاکٹرس بنا فیس لیے کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پرتھمیش گھوش ذاتی طور پر ان دواخانوں کا نظم و نسق دیکھتے ہیں۔ میں صدرِ محترم تھامس اسمتھ سے گذارش کروں گا کہ وہ ڈاکٹر گھوش کو انعام دے کر ان کی عزت افزائی کریں۔ ساتھ ہی میں آپ تمام حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ کھڑے ہو کر ڈاکٹر گھوش کا استقبال کریں۔''

ڈاکٹر گھوش اسٹیج پر پہنچے اور انھوں نے رابرٹ سے مائک لیا اور اعلان کیا، ''میں آپ سب سے معذرت چاہتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ یہ انعام مجھے میرے ڈیڈ کے ہاتھوں دلایا جائے۔''

اعلان کرتے ہی ہال میں کھلبلی مچ گئی۔ ورلڈ ہیلتھ اسوسی ایشن کے منتظمین کبھی بھی ایسے حالات سے دو چار نہیں ہوئے تھے۔ ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کے صدر نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا، ادھر پرتھمیش کے ڈیڈ بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ منتظمین کشمکش میں پڑ گئے تھے۔ ان کے لیے حالات کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کے سکریٹری نے کافی جدوجہد کے بعد حالات کو قابو میں کیا اور یہ طے پایا کہ انعام ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کے صدر اور پرتھمیش کے ڈیڈ دونوں مل کر دیں گے۔ ورلڈ ہیلتھ ایسوسی ایشن کی

تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ڈاکٹر پرتھیمیش کو انعام دیا گیا۔پورا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا ۔تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان ہی اینکر رابرٹ نے اعلان کیا:

''اب میں ڈاکٹر گھوش سے گذارش کروں گا کہ وہ چند الفاظ میں اپنے اور اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بتائیں۔''

ڈاکٹر گھوش نے بولنا شروع کیا۔

''آپ کو میرے پروجیکٹ 'میرا گاؤں میرا دواخانہ' کے بارے مسٹر رابرٹ نے بتا دیا ہے۔میں آج آپ کو وہ باتیں بتاؤں گا جس کے بارے میں آج تک کسی کو کچھ نہیں معلوم ہے۔یہ بات اس وقت کی ہے جب میں بارہویں جماعت میں تھا اور میڈیکل کی تیاری کر رہا تھا۔میری ممی اور ڈیڈ مجھے بہت چاہتے تھے۔انھوں نے مجھے بہت نازوں سے پالا تھا۔میں خواہش ظاہر کرتا اور وہ چیز حاضر ہو جاتی۔ڈیڈ اور ممی میرے اخراجات کس طرح اٹھا رہے تھے، مجھے اندازہ بھی نہیں تھا اور ان لوگوں نے کبھی مجھے احساس بھی نہیں ہونے دیا۔آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ اتنی آمدنی نہ ہونے پر بھی انھوں نے میرے تمام اخراجات اٹھائے۔وہ لوگ اپنی بیماری پر خرچ نہیں کرتے تھے لیکن میری ہر ضرورت پوری کرتے تھے۔ان کے لاڈ پیار میں میں بہت ضدی ہو گیا تھا۔بارہویں جماعت تک میری ماں مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی۔میں ان کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا تھا اور میرے ڈیڈ نے بھی کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر بولنا شروع کیا

''ایک دن کی بات ہے میرا ہم جماعت روہن ایک نیا اسمارٹ فون لیکر آیا۔ہم سب ساتھیوں کو بہت تعجب ہوا کہ امتحان کے وقت اسمارٹ فون۔ساتھ ہی اس نے ہم سب کو چیلنج کیا کہ صرف میرے ڈیڈ ہی ایسا اسمارٹ فون دلا سکتے ہیں اور کسی کے نہیں۔پھر کیا تھا میں نے اسی وقت ٹھان لیا تھا کہ کل میرے پاس بھی نیا اسمارٹ فون ہوگا۔گھر آتے ہی میں نے ممی سے نئے فون کے لیے ضد کرنا شروع کر دی۔ممی نے کہا ،

''ٹھیک ہے دلا دیں گے، ڈیڈ کو آنے دو۔'' رات کے نو بجتے ہی ممی نے کھانا لگا دیا۔ڈیڈ کھانا کھانے بیٹھ چکے تھے۔میں اپنے کمرے میں پڑھائی کر رہا تھا۔ممی نے مجھے کھانے کے لیے بلایا۔میں کھانا کھانے آیا اور موقع غنیمت جان کر موبائل دلانے کی ضد کرنے لگا۔ممی مجھ سے بار بار کہہ رہی تھیں بیٹا پہلے کھانا کھالے، کہا نا دلا دیں گے۔

'نہیں مجھے کل ہی چاہیے ہے۔'

' ہاں ہاں ، کھانا تو کھالے ، کل ہی دلا دیں گے۔'

'نہیں آپ ایسے ہی بول رہی ہو، آپ نہیں دلاؤ گے، پہلے آپ وعدہ کرو۔مجھے معلوم تھا کہ اگر میرے ممی ڈیڈی وعدہ کر لیں گے تو ضرور دلائیں گے۔مجھے بھی ضد ہو گئی تھی۔میں نے کہا،

'' آپ جب تک وعدہ نہیں کرو گے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

اتنے میرے ڈیڈ کھانا کھاتے کھاتے بولے،

''دیکھو پرتھیمیش ، ہم ابھی موبائل نہیں دلا سکتے۔یہ کوئی وقت ہے موبائل لینے کا۔اپنے امتحان پر دھیان دو۔امتحان کے بعد دلا دیں گے۔''

''ڈیڈ، میں آپ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''تم کسی سے بھی کہو لیکن موبائل ابھی نہیں ملے گا۔''

میری ماں نے بھی مجھ سے کہا ،'' بیٹا کھانا کھالے، کہہ دیا نا امتحان کے بعد دلا دیں گے۔''

''نہیں کھانا ہے مجھے۔''

میں اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔میں اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔تھوڑی دیر کے بعد میری ماں آئیں اور دروازہ کھٹکھٹانے لگیں،'' بیٹا پرتھیمیش، کھانا کھالے'' وہ دروازہ پیٹتی رہی اور بولتی جا رہی تھی۔میں غصّے میں بیٹھا سنتا رہا۔کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر ممی کی آواز آئی،'' بیٹا آ جانا، میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔''

باہر ممی کی آواز آ رہی تھی ،'' ارے ، آپ سمجھائیے نا پرتھیمیش کو۔''

ممی کے کہنے پر ڈیڈ بھی آ گئے اور حکم دیا'' پرتھیمیش کھانا کھاؤ ،تمہاری ممی نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔''

میری ماں کی روندھی ہوئی آواز پھر آئی،'' آجا! میرے لال''

لیکن اس دن میرے اوپر بھوت سوار تھا اور میں نے اپنی ماں کی روندھی ہوئی آواز کی بھی پرواہ نہیں کی۔اتنا کہہ کر ڈاکٹر پرتھیمیش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔انھوں نے اپنا چشما اتارا اور اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

پرتھیمیش کے ڈیڈ کی نظروں کے سامنے ۴۰ سال پہلے کے تمام واقعات ایک ایک کر کے رونما ہونے لگے۔ان کی آنکھوں سے بھی بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔وہ سوچنے لگے، ہاں بیٹا، تو نے تو دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور ادھر تیری ماں کا حال برا تھا۔جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا تیری ماں کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔کبھی وہ تیرے کمرے کے پاس دوڑ کر جاتی اور کبھی میرے کمرے میں آتی۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی کہنے کی کہ امتحان بعد دلاؤں گا۔اگر کہہ دیتے ہاں دلا دوں گا تو آپ کا کیا چلا جاتا۔''

''کل پھر وہ کہتا مجھے موبائل دلاؤ''

''ارے،کل ہوتا تو میں اسے سمجھا لیتی نا۔۱۲ بج رہے ہیں، بھوکا پیاسا بیٹھا ہے میرا بچّہ۔''

''ارے بھوک لگے گی تو خود کھالے گا۔''

"نہیں کھائے گا، مجھے معلوم ہے وہ بہت ضدی ہے۔ جب تک اس سے وعدہ نہیں کروگے نہیں کھائے گا۔"

"شبھدا تم اتنا کیوں پریشان ہو رہی ہو، میں کہہ رہا ہوں بھوک لگے گی تو کھالے گا۔"

"آپ چلو پلیز، چلو آپ، اس سے کہہ دو آپ دلا دوگے۔"

شبھدا کی پریشانی دیکھ کر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، "پرتھیمیش، ٹھیک ہے تجھے موبائل دلا دوں گا، چل اب کھانا کھالے۔" تیری ماں کا چہرہ خوشی سے لال ہو گیا تھا۔ "پرتھیمیش بیٹا، دیکھ اب تو تیرے ڈیڈ نے وعدہ کر لیا۔ چل آ جا میرے لال۔" لیکن پرتھیمیش نہ تو تونے دروازہ کھولا اور نہ ہی تو آیا۔ میں بہت دیر تک تیری ماں کے ساتھ تیرے کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ مجھے اس وقت بہت غصّہ آ رہا تھا۔ میں نے تیری ماں سے کہا، "تمہارے لاڈ نے بگاڑ دیا ہے۔ بدتمیز ہو گیا ہے وہ۔ کیا چاہتا ہے کہ ماں باپ اس کے آگے ہاتھ جوڑیں کہ بیٹا ہمیں معاف کر دے ہم سے غلطی ہو گئی۔ دیکھو مجھے بہت نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہا ہوں۔"

"پلیز ایک بار اور کوشش کریے پلیز۔"

"نہیں، اب مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم چاہتی ہو میں اس کے آگے گڑگڑاؤں۔" میں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ تیری ماں تیرے کمرے کے باہر ہی بیٹھی کمرے کا دروازہ پیٹتی رہی اور بار بار تجھے سمجھاتی رہی۔ میری آنکھیں بری طرح بند ہو رہی تھیں لیکن شبھدا کی وجہ سے میں سو نہیں پا رہا تھا۔ قریب ایک بجا ہوگا کہ شبھدا میرے پاس گھبرائی ہوئی آئی، "دیکھو، دیکھو تم دروازہ توڑ دو، ہے بھگوان! میرے بیٹے کی رکھشا کر، دیکھو کہیں اس نے کچھ کر تو۔۔۔" اس کے الفاظ اس کے منہ میں دب کر رہ گئے۔ میں نے اسے سمجھایا، "کچھ نہیں ہوگا اسے شبھدا! صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ضد میں آ گیا ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔"

"نہیں آپ دروازہ توڑو! پولس کو بلاؤ۔"

"شبھدا کیا تم پاگل ہو گئی ہو، اتنی رات ہو گئی ہے اور پھر پولس کو کیوں بلائیں، صبح کو دیکھیں گے۔ چلو اپنے بستر پر۔"

"نہیں آپ جاؤ، آپ کو بہت نیند ستا رہی ہے۔ جائیے آپ سو جائیے۔ میں یہاں سے نہیں ہٹوں گی جب تک وہ دروازہ نہیں کھولے گا۔ وہ ضدی ہے تو میں بھی ضدی ہوں۔"

"شبھدا! وہ سو گیا ہوگا۔ اگر جاگتا ہوتا تو دروازہ کھول دیتا۔"

"نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے اگر کچھ۔۔۔" تیری ماں وہیں بیٹھ گئی۔ وہ چلاتی رہی، دروازہ پیٹتی رہی۔ دو بج چکے تھے۔ نیند کے مارے میرا حال برا ہو رہا تھا۔ میں شبھدا پر غصّہ کرنے لگا، "شبھدا تمہیں نہیں سونا ہے تو مت سو، مجھے تو سونے دو۔ اور یہ اپنا چیخنا چلّانا بند کرو۔"

میرے کہنے پر شبھدا تجھے آہستہ آہستہ آوازیں دینے لگی اور دروازہ بھی بہت آہستہ سے کھٹکھٹا رہی تھی۔ نا جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ میں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا۔ صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ شبھدا بستر پر نہیں تھی اور نہ ہی اس کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ تونے دروازہ کھول دیا اور وہ تیرے کمرے میں ہی سو گئی۔"

تبھی ڈاکٹر پرتھیمیش نے آنکھوں پے چشما چڑھایا اور بولنے لگے، "بہت شور کی وجہ سے میری آنکھ کھلی، میرے کمرے کا دروازہ بہت زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ واچ مین کی باہر سے آواز آ رہی تھی، "پرتھیمیش بھیّا! دروازہ کھولیے، دروازہ کھولیے" میں ہڑبڑا کر اٹھا اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی میرا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میرے کمرے کے دروازے کے باہر میرے ڈیڈ ممی کو اپنی گود میں لیے گم سم بیٹھے تھے۔ میری ماں ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ممی کا انتم سنسکار کیا گیا۔ جیسے جیسے دن گذرتے رہے ہمارا گھر بھی خالی ہوتا گیا۔ صرف میں اور میرے ڈیڈ ہی گھر پر رہ گئے تھے۔ میرے ڈیڈ پتھر کی مورت بن گئے تھے۔ نہ بولتے تھے نہ روتے تھے نہ ہی کسی سے کچھ کہتے تھے ان کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ اپنی ممی کا میں قاتل بن گیا تھا اور اپنے ڈیڈ کا مجرم۔ میری ممی مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنی ماں کا خواب ضرور پورا کروں گا۔ میرے ڈیڈ کی طرف سے مجھے ہر طرح کا سپورٹ تھا بس میں ان کے بول سننے کو ترس گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اپنے آپ کو خدمتِ خلق میں لگا دیا اور آج میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں لیکن آج بھی میں پرائسچت کی آگ میں جل رہا ہوں۔" روتے بلکتے ہوئے ڈاکٹر پرتھیمیش گھوش نے کہا، "ڈیڈ اب تو مجھے معاف کر دیجیے۔ صرف ایک بار اپنے سینے سے لگا لیجیے صرف ایک بار۔ ڈیڈ پلیز کچھ تو کہیے مجھ سے۔۔۔" اور یہ کہتے کہتے ڈاکٹر گھوش غش کھا کر گر پڑے۔ ہال میں افراتفری مچ گئی۔ ڈاکٹر گھوش کو اسپتال لے جایا گیا۔

ڈاکٹر پرتھیمیش گھوش کو آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ دو کپکپاتے ہونٹوں نے ان کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کانوں میں آواز گونجی۔ "آنکھیں کھول بیٹا پرتھیمیش! آج تیری ماں کی برسی ہے۔"

پرتھیمیش کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ ہوٹل میں ہی ایک سادہ تقریب میں ان کی شادی سنندا سے ہو گئی۔ پرتھیمیش نے سنندہ کے ماتھے کو بوسہ دیا جس کا سنندہ کو چالیس سال سے انتظار تھا۔

❑❑❑

کسوٹی

عارف محمود
675/14، کے ڈی اے کالونی، جاج مئو کانپور
موبائل: 9793862233

میں واش روم میں تھا اور میرا موبائل باہر ایک اسٹول پر رکھا تھا۔ کسی کی کال دوبار آچکی تھی۔ پھر جب کچھ وقفہ کے بعد تیسری بار رنگ آئی تو مجھے اہمیت کا احساس ہوا میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر دیکھا تو موبائل اسکرین پر بڑی اماں کا نام دکھائی پڑا اور میرا موڈ آف ہوگیا۔ ہنھ چھ سات ماہ کے بعد ساجد کی یاد آگئی کوئی غرض یا تکلیف پہنچانے کا نیا پلان ہوگا۔ اس بار بھی پوری رنگ بج کر ختم ہوگئی۔

ناشتہ کی میز پر میں صالحہ کے ساتھ آج کی چھٹی کو کارآمد بنانے کے پروگرام بنا رہا تھا اور میرے ذہن میں بڑی اماں کے فون کی گھنٹیاں بھی بج رہی تھیں کہ اچانک واقعی ان کا فون آگیا۔

صالحہ فون رسیو کر کے کہہ دو کہ ابھی باتھ روم میں ہیں آدھے گھنٹے کے بعد کیجئے گا۔ صرف اتنی سی بات کہنے میں صالحہ کو مزید دو تین منٹ بات کرنا پڑی۔ میں نے اشارہ کیا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

''کیا ہوا تم تو لمبی چپک گئیں؟''

''کیا کرتی فون تو ادھر سے ہی آیا تھا اور آج ایسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں جیسے مجھ سے زیادہ وہ کسی سے محبت ہی نہیں کرتی ہیں۔ ابھی پچھلے ماہ مارکیٹ میں ملیں تھیں تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔''

میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی خاص غرض ہے اور پھر میں اپنی آنکھیں بند کر کے ایک صوفہ پر بیٹھ گیا--- بڑی اماں کا کرخت چہرہ سامنے آگیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی چھچھوری باتوں سے ہر وقت اپنی امارت کا اظہار کرنے والی شخصیت یاد آگئی۔

ابا بیڈ پر اپنی آخری سانسیں پوری کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کہہ کر چلا گیا تھا جن اعزہ کو بلانا ہو بلا لیجئے کسی وقت بھی سانس رک سکتی ہے۔ اماں سکتہ کے عالم میں آنکھیں پھاڑے ابا کے سرہانے بیٹھی تھیں اور میری دونوں شادی شدہ بہنیں فرش پر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ سارا گھر پڑوس کی عورتوں سے بھرا تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ بڑے ابا اپنی بیوی اور بیٹی شمو کے ساتھ آرہے ہیں۔ اندر آکر بڑے ابا نے اپنے بھائی کے ماتھے کو چھوا اور نہ جانے کیسے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑی اماں نے ناک پر دوپٹہ رکھ کر اپنے دیور کو دیکھا اور پھر دور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بڑے ابا نے پہلے اماں کے سر پر ہاتھ رکھا پھر مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ شاید یہ سین بڑی اماں نے دیکھ لیا اور ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔

''بھئی شمو کے ابا میری تو طبیعت ہول رہی ہے مجھے فوراً یہاں سے لے چلو اور ہاں ڈرائیور سے کہو کہ ڈاکٹر کی طرف سے ہوتا ہوا چلے اپنا چیک اپ کرالوں۔ پھر اچانک وہ ابا کے سرہانے گئیں اور میری ماں کے ہاتھ میں پڑا ہوا سونے کا کڑا پکڑ کر بولیں۔ ''ارے شکیلہ یہ کڑا تو تم نے کئی ماہ پیشتر کسی تقریب میں جانے کے لئے مجھ سے مانگا تھا۔ میں بھی بھول گئی تھی۔'' اس سے قبل کہ اماں کوئی جواب دیں شمو آپا نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے ہٹا لیا۔ ''امی آپ پاگل ہوگئی ہیں۔ یہ کڑا تو میں برسوں سے چچی صاحبہ کے ہاتھ میں دیکھ رہی ہوں اور یہ کوئی مناسب موقع ہے کڑے کی بات کرنے کا۔ آپ تو ابھی دس پندرہ دن پہلے اپنا کڑا پہن کر پڑوس میں نسیم کے بیٹے کے عقیقہ میں گئی تھیں۔ ابا ان کو فوراً ڈاکٹر کے ہاں لے جایئے اور ٹھیک سے چیک اپ کرایئے۔''

''کیوں تم نہیں چل رہی ہو۔'' بڑی اماں پر شمو کی بات کا کوئی اثر نہیں تھا۔

''نہیں میں اس حالت میں اپنے بھائی بہنوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

ان کے جاتے ہی کسی پڑھی لکھی پڑوسن نے زور سے کہا۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔ خس کم جہاں پاک۔'' میں نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ آواز کہاں سے آئی کیونکہ یہ تو میرے دل سے نکل کر وہاں تک پہونچی تھی۔

ابا کے انتقال کے بعد گھر کے حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ باہر کے کمرے میں ان کی جنرل مرچنٹ کی چھوٹی سی دوکان تو ان کی بیماری میں ہی بند ہوچکی تھی اور گھر کے اخراجات میری پڑھائی کا خرچ سب کچھ میری ٹیوشن کی آمدنی اور دوکان کا اثاثہ فروخت کر کے چل رہا تھا۔ میرا انجینئرنگ کا آخری سال تھا کالج کی یکمشت فیس جمع کرنی تھی کہیں سے شمو آپا تک خبر پہونچ گئی اور انھوں نے کالج جا کر پوری فیس جمع کردی۔

باقی ص ۳۴ پر....

ساجدہ زیدی
۱۹۲۶ء ۲۰۱۱ء

غزل

کشت ویراں کی طرح تشنہ رہی رات مری
لوٹ آئی ترے در سے بھی مناجات مری

تو لہو بن کے رگوں میں مری دوڑا لیکن
تشنۂ دید رہی تجھ سے ملاقات مری

دل پہ کھلتے نہیں اسرار وجود اور عدم
یہی حیران نگاہی ہے مکافات مری

کون سمجھا مری بیدار نگاہی کی حدود
یوں تو ہر ہاتھ میں تھی شرح حکایات مری

گرچہ آوارہ رہے میرے فسانے ہر سو
راز سر بستہ زمانے میں رہی ذات مری

ساز, و آہنگ کا اعجاز تھا ہر لفظ مرا
پھونک ڈالی خس وخاشاک نے سوغات مری

ہیں زمیں اور زماں دود چراغ شب غم
مجھ کو لے آئی کہاں گردش حالات مری

کون سمجھا مری بیدار نگاہی کی حدود
یوں تو ہر ہاتھ میں تھی شرح حکایات مری

ساجدہ زیدی بنیادطور پر نظم کی شاعرہ تھیں۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں اردوادب کے وسیع حلقہ میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نسائی جذبات اوراس کے پیچیدہ نفسیات کی گرہ کشائی بڑی فنی ندرتوں کے ساتھ کی اور خاص کر مرد اساس معاشرے میں عورتوں کے بنیادی حقوق جیسے مسائل پر بھی آواز بلند کی۔ آزادئ نسواں کی تحریک کی ابتدا کے دور میں ان کی شاعری کبھی عورت کے عنقاء کر دئے گئے حقوق کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آئی تو کبھی عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کو واگزار کرتی ہوئی۔ ان کی نظمیں عصری تقاضوں اور تیزی سے بدلتی ہوئی بیسویں صدی کے اواخر کے حالات میں اکیسویں صدی کی آمد آمد کے لئے عورت کو تیار رہنے کا سبق بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

شاعری کے علاوہ ساجدہ زیدی ایک بہترین نثر نگار بھی تھیں۔ انہوں نے کچھ اہم ناول بھی تخلیق کئے جیسے 'مٹی کے حرم'، 'موج ہوا پیچاں' اور ایک منظوم ڈرامہ ''سرحد کوئی نہیں'' کے نام سے لکھا۔ ان کے شعری مجموعے 'آتش سیال'، 'آتش زیر پا'، 'پردہ ہے ساز کا' منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ تعلیم و تدریس سے وابستگی کے ساتھ ساتھ تحقیقی و تخلیقی کاموں میں بھی کافی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ساجدہ زیدی کے ۹۲ویں یوم ولادت کے موقع پر ادارہ 'نیادور' کی جانب سے پیش ہے ان کی ایک نظم اور دو غزلیں۔

فقیری میں

فقیری میں بھی خوش وقتی کے
کچھ سامان فراہم تھے

خیالوں کے بگولے
مضطرب جذبوں کے ہنگامے،
تلاطم بحر ہستی میں
تموج روح کے بن میں،
عجب افتاں وخزاں مرحلے پہنائی شب کے،
تڑپ غم ہائے ہجراں کی
لرزتی آرزو دیدار جاناں کی

عدم آباد کے صحرا میں ایک ذرہ
کہ مثل قطرۂ سیماب لرزیدہ
صدف میں ذہن کے جوں
گوہر کمیاب پوشیدہ
دل صد پارہ
جوئے غم
لرزتی کشتئ احساس
جہاں بینی کا دل میں عزم دزدیدہ
فقیری میں یہی اسباب ہستی تھا یہی درد تہہ جام تمنا تھا
یہی ساماں بچا لیتے تو اچھا تھا

فقیری میں مگر یہ کون سی افتاد آئی ہے
کہ ساماں لٹ گیا راہوں میں کاسہ دل کا خالی ہے

غزل

رات گہری ہے تو پھر غم بھی فراواں ہوں گے
کتنے بجھتے ہوئے تارے سر مژگاں ہوں گے

قہر ہے ساعت محشر ہے کہ کہرام فنا
خاک اس شہر فنا کوش میں انساں ہوں گے

شہر ہو دشت ہو محفل ہو کہ ویرانہ ہو
ہم جہاں جائیں وہی خار مغیلاں ہوں گے

کیسے اس شہر خرابی میں بسر کی ہم نے
کل جو آئیں گے وہ انگشت بدنداں ہوں گے

شام سے دل میں ترازو ہے کوئی تیر ستم
رات گزرے گی نہ خوابوں کے شبستاں ہوں گے

دید کا بار امانت نہ اٹھے گا اس شب
خونچکاں صبح تلک دیدۂ حیراں ہوں گے

فکر محبوس ہوئی حرف دعا گنگ ہوا
اہل ایمان و نظر خاک بہ داماں ہوں گے

عارف محمود

....بقیہ ص ۳۱ کا

شموآپا عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑی تھیں لیکن جب ہم سب ایک ساتھ رہتے تھے تو سب سے چھوٹے ہونے کی بنا پر ہم دونوں ہی نہ صرف بہن بھائی تھے بلکہ وہ میری دوست بھی تھیں پھر اچانک انقلاب آ گیا۔ بڑی اماں جو ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں انھوں نے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ بچے بڑے ہونے لگے تو گھر کے ساتھ ہی آمدنی بھی تنگ ہوگئی۔ ہمارے گھر کے باہری کمرے میں بنی ہوئی مشترکہ دوکان کی آمدنی اب بڑے ابا اور ہمارے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی ۔ بڑی اماں کے والد نے اپنے داماد کو اپنی فیکٹری میں منیجر کی ملازمت دے دی اور بیٹی کے نام سے ایک رہائشی مکان بھی خرید کر دے دیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ ہمارا رہائشی مکان اماں کے نام تھا۔ جو ان کو اکلوتی اولاد ہونے کی بنا پر مائیکہ سے ملا تھا ورنہ مکان کی تقسیم ہونے کی صورت میں ہماری فیملی فٹپاتھ پر آجاتی۔

میں نے انجینئرنگ کے فائنل امتحان میں پورے ضلع میں ٹاپ کیا اس لئے فوراً ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہتر ملازمت مل گئی اور رفتہ رفتہ گھر کے حالات ٹھیک ہوتے گئے ۔ اس تبدیلی کی سب سے زیادہ خوشی میری ماں کے بعد شموآپا کو ہوئی تھی ۔ گزشتہ تمام واقعات ایک فلم کی طرح میری بند آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے ۔ حالات موافق ہوئے تو امی نے میرے رشتہ کے لئے لڑکی کی تلاش شروع کر دی لیکن میں بضد تھا کہ شموآپا مجھ سے بڑی ہیں پہلے ان کے لئے بہتر رشتہ تلاش کیا جائے تب امی نے مجھے بتلایا کہ بڑی اماں کا معیار دولت مند گھرانے کے ساتھ ہی ہڈی اور ذات پات سے جڑا ہوا ہے خواہ لڑکا زانی ہو یا شرابی کیونکہ اسی طرح کا ایک رشتہ جو بڑی اماں کو بہت پسند تھا اُسے شموآپا نے یہی کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ خاندان چاہے جتنا بڑا ہو میں شرابی لڑکے سے شادی نہیں کر سکتی ۔ بڑے ابا کی اپنی کوئی رائے پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو فیکٹری منیجر ہونے کے بعد ان کا ریموٹ کنٹرول صدفی صد بڑی اماں کے ہاتھ میں تھا۔

جب میرے ہاں شادی کی تیاریوں کی دھوم دھام تھی تو اس طرف شموآپا نے یہ کہہ کر اپنے گھر میں تہلکہ مچا دیا کہ وہ اپنے کالج کے ایک دوست افضال احمد ادریسی سے شادی کرنا چاہتی ہیں جو گریجویشن تک ان کے ساتھ پڑھا تھا اور اب آئی اے ایس کا فائنل امتحان دے رہا تھا ۔ بڑی اماں کے پیروں کے نیچے جیسے کسی نے آگ بچھا دی ۔ ہرگز نہیں ، سید سجاد احمد کی نواسی کی شادی افضال ادریسی سے یعنی درزیوں کے خاندان میں، میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔

شموآپا نے یہ پھلجھڑی چھوڑ کر بالکل خاموشی اختیار کر لی ان کی ماں دو چار دنوں تک پورے خاندان کی ناک کٹنے کی دہائی دیتیں رہیں پھر جب ان کا غصہ کم ہوا تو شموآپا نے فون کر کے مجھے یہ کام سونپا کہ میں ان کی ماں کو سمجھاؤں۔ یہ سمجھانا بغیر ہتھیار کے شیر کا شکار کرنا تھا۔ میں کئی دنوں تک پروگرام بناتا رہا اور پھر اس آگ میں کود پڑا۔

''بڑی اماں ہمارے شہر میں ادریسی اینڈ سنس کی سب سے معتبر ٹیلرنگ شاپ ہے ۔ سارا گھر پڑھا لکھا ہے۔ ان کا رہن سہن آپ کے ابا جان کے خاندان سے کم نہیں ہے ۔ افضال آئی - اے - ایس - کا امتحان پاس کر چکا ہے اور اس سے زیادہ اہم بات تو یہ کہ شموآپا کی پسند ہے۔'' میرے تمام دلائل انھوں نے ایک جملے سے یہ کہہ کر رد کر دیئے کہ'' آج سمجھ میں آیا کہ تم اور تمہاری ماں مجھ سے بدلہ لے رہے ہیں ۔ میری بیٹی کو خراب کرنے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے۔ شمو کو سمجھا دو کہ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔''

سارے الزامات کو خاموشی کے ساتھ سن کر میں چلا آیا لیکن بڑی اماں سے ہمارا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

میری شادی میں اس گھر سے شموآپا کے علاوہ کوئی شریک نہیں ہوا اور آپا نے پوری طرح ایک بہن کا کردار ادا کیا۔

اپنی شادی کے چند ماہ بعد میں اپنی بیوی صالحہ کے ساتھ شاپنگ کر رہا تھا تو ایک دوکان پر شموآپا نظر آ گئیں ۔ بہت بجھی بجھی سی تھیں جیسے کسی بیماری سے اٹھی ہوں ۔ میرے سوال کو انھوں نے چہرے سے ہی پڑھ

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

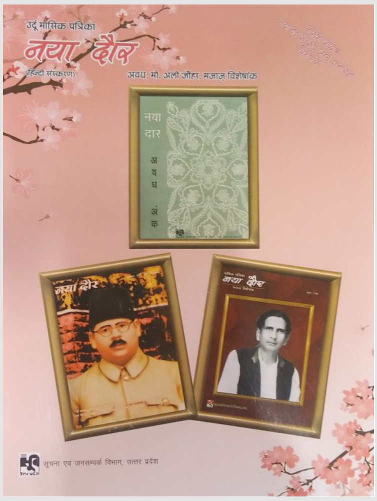

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

لیا۔’’ آؤ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔‘‘

کافی کا آرڈر دینے کے بعد نہایت سپاٹ سے لہجے میں اطلاع دی کہ’’ انھوں نے افضال کو کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے کیونکہ آئی-اے-ایس-کرنے کے بعد گھروالوں کا دباؤ تھا کہ یا تو اپنی پسند سے شادی کرو یا ماں باپ کی پسند سے۔ میں نے اس کو آزاد کر دیا۔‘‘ پھر ان کی آنکھوں سے بارش شروع ہوگئی۔ صالحہ دم بخود تھی کیونکہ اس کو میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے پانی کا گلاس شموآپا کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پی کر کچھ نارمل ہوئیں۔’’ ساجد کیا تم یقین کرو گے کہ افضال کا رشتہ میرے ماموں کی بیٹی کے لئے دیا گیا ہے جو شاید منظور کر لیا جائے گا۔ اور اس سے زیادہ حیرت انگیز اور گندی بات یہ ہے کہ میری ماں کو افضال کی فیملی کے خلاف بھڑکانے والی میری یہی مامی ہیں۔‘‘

اچانک موبائل کی رنگ سے سارا پس منظر غائب ہو گیا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ اسکرین پر بڑی اماں کا نام دکھائی پڑا۔ جی بڑی اماں ایک لمبے عرصہ کے بعد آپ نے یاد کیا۔ دل دکھانے کے لئے یا کوئی خاص غرض ہے۔؟

ساجد بیٹا اس وقت تمہاری بڑی اماں سے زیادہ تمہاری شموآپا کی ماں بول رہی ہوں۔ طنزیہ باتیں چھوڑو میری مدد کرو۔ پھر انھوں نے گزشتہ دو سال کی پوری کہانی سنا دی جس کا بیشتر حصہ لفظ بہ لفظ مجھے معلوم تھا۔ کیونکہ افضال کے شادی کے بعد بھی شموآپا نہ صرف ذہنی طور پر افضال سے قریب تھیں بلکہ ان لوگوں کے ہر دکھ درد میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔ ایک بار میں نے ہنس کر کہہ دیا۔’’ آپ کو صفیہ سے جلن نہیں ہوتی کہ اس نے آپ کا حق مار لیا ہے۔؟

’’ بالکل نہیں اس میں اس کا کیا قصور ہے۔؟ اصل قصوروار تو میری ماں اور اس کی ماں ہیں۔‘‘ کچھ دنوں کے بعد کار کے ایک زبردست حادثہ میں افضال، صفیہ اور ان کا ایک سال کا بچہ سخت زخمی ہو گئے۔ دس بارہ دن اسپتال میں رہ کر افضال اور ان کا بچہ تو صحت پا کر باہر آ گئے لیکن صفیہ کو نہ بچایا جا سکا۔ شموآپا نے وہ دس بارہ دن ان لوگوں کی دیکھ بھال کی نذر کر دیئے اور ایک ایک پل کی خبر مجھ کو دیتی رہیں۔ صفیہ کی موت کے بعد شموآپا تو کھلی آنکھوں کے ساتھ جیسے کوما میں چلی گئیں تھیں۔ اپنے سے بالکل بے خبر بہر حال وقت تو ہر زخم کو بھر دیتا ہے اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ اب نارمل ہو رہی تھیں۔

بڑی اماں کی کہانی کا کوئی اختتام نہیں تھا۔ کہ میں نے ان کو ٹوک دیا معاف کیجئے گا اتنی لمبی تمہید کے بعد اب آپ جو کہنا چاہتی ہیں اس کا علم مجھے ہو چکا ہے آپ اب بھی ان بھابی کی مدد کرنا چاہتی ہیں جنھوں نے آپ کی بیٹی کی زندگی کے دو قیمتی سال برباد کر دیئے۔ آپ کی بھابی نے اب اس معصوم بچہ کا واسطہ آپ کو دیا ہوگا کیونکہ افضال کے گھر والے اس کے لئے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ عورت نواسے کی محبت میں شموآپا کے پرانے زخم تازہ کرنے کی فکر میں ہے۔‘‘

ساجد شمو کی خوشی کے لئے اب میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ پہلے جو غلطی مجھ سے ہو چکی ہے اب اس کا کفارہ ادا کر دوں۔ میری بیٹی کے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہو چکی ہے کیا تم اس کو دوبارہ خوش نہیں دیکھنا چاہتے۔؟

’’میری بات چھوڑیئے میں نے شموآپا کی خوشی کے لئے آپ کو بہتر رائے دی تھی لیکن آپ نے مجھے اور میری ماں کو اپنا دشمن ثابت کر دیا تھا تو کیا اب آپ کی کسوٹی کا معیار تبدیل ہو چکا ہے؟ درزیوں والے خاندان کے علاوہ اب تو افضال کے نام کے ساتھ دو عیب اور بھی جڑ چکے ہیں۔ اس کا شادی شدہ ہونے کے ساتھ ایک بچہ کا باپ ہونا۔‘‘

ساجد پلیز اور زیادہ ذلیل مت کرو۔ میری ہمت شمو سے بات کرنے کی نہیں ہے لیکن تم اس کو راضی کر سکتے ہو۔ میں کل تمہارے گھر آ رہی ہوں بہت دن ہو گئے تمہاری ماں سے ملاقات نہیں ہوئی پھر ان کا فون ڈِس کنکٹ ہو گیا۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

’نیا دور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ’اودھ نمبر‘ بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ ’نیا دور‘

غزل

تو جو آجائے تو پھر گھر کو سنورتا دیکھوں
اک بیاباں سے میں گلشن کو ابھرتا دیکھوں

چند لمحے جو ترے قرب کے مل جاتے ہیں
انھیں لمحوں کو میں صدیوں پہ بکھرتا دیکھوں

خواب آنکھوں میں ترے خواب ہی اترے پل پل
اپنی پلکوں پہ ترا خواب نکھرتا دیکھوں

تجھ سے ملنا مری قسمت میں نہیں ہے پھر بھی
تجھ کو سوچو کہ تجھے دل سے گزرتا دیکھوں

لفظ مرجائیں گے اظہار کی شدت سے امامؔ
عشق کو حسن کے پردے سے ابھرتا دیکھوں

افتخار امام صدیقی
202/228، دیناتھ بلڈنگ، تھرڈ فلور، پی بی مارگ، ممبئی
موبائل: 9324515157

غزل

زمیں کبھی نہیں بدلی نہ آسماں بدلا
بدلنا جس کو نہیں تھا وہ مہرباں بدلا

ہمارے دم سے ہے گلشن میں موجِ فصل بہار
بدلنا جس کو نہیں تھا وہ مہرباں بدلا

کچھ اس طرح سے ہی باہم وفا نبھائی ہے
کبھی یقین ہے بدلا کبھی گماں بدلا

سوال جب کبھی آیا ہمارے قاتل کا
تو منصفی کا بھی کچھ طرزِ امتحاں بدلا

کہاں گئے وہ مسرت کے دن، وہ ہمسائے
مکیں مکیں ہے جو بدلا، مکاں مکاں بدلا

چمن میں ان دنوں طوفاں کا بول بالا ہے
اسی بنا پہ پرندوں نے آشیاں بدلا

ہر ایک راز مناظرؔ کا ہو گیا ہے عام
کچھ اس طرح سے محبت میں رازداں بدلا

مناظرؔ عاشق ہرگانوی
کوہسار، بھیکان پور۔۳، بھاگلپور (بہار)
موبائل: 9430966156

غزل

ہم کو شکوہ ہی نہیں غم کی فراوانی کا
روز سہتے ہیں ستم آپ کی نادانی کا

جن کو دعویٰ ہے بہت اپنی جہاں بانی کا
حد سے گزرا ہے ستم ان کی ستمرانی کا

آئینہ دیکھا انہوں نے انہیں آئینے نے
دونوں کو آج مزہ مل گیا حیرانی کا

دل سے اے جان جہاں پھر تری تصویر بنے
خامہ مل جائے مجھے آج اگر مانی کا

ہو گئے بار گنہ ناز میں سجدے مقبول
نور کہتا ہے یہی آپ کی پیشانی کا

ایک سے بڑھ کے غرض ایک سخنور ہیں یہاں
کوئی دعویٰ نہ کرے اپنی سخندانی کا

شکر ہے مل گیا غم ان کا ہمیں اے شاہینؔ
سلسلہ ختم ہوا، بے سر و سامانی کا

سلمیٰ شاہین
نیو ہاریزن اپارٹمنٹ، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی
موبائل: 9971824933

غزل

قدم قدم پہ وفا کا فریب کھاتے ہوئے
میں تھک چکا ہوں رفیقوں کو آزماتے ہوئے

گزر بھی جا غم دل شانِ بے نیازی سے
درِ نشاط پہ اک قہقہہ لگاتے ہوئے

مرا وجود تمہیں جیتنے نہیں دے گا
کہا چراغ نے راتوں سے جگمگاتے ہوئے

کسی گلاب نے اس کے لبوں کو چوم لیا
وہ جارہا تھا مرے شعر گنگناتے ہوئے

ہنسو! نہ مجھ پہ شب تار کے پرستارو!
دیا جلا تو دیا انگلیاں جلاتے ہوئے

بکھر گئے بھی تو اپنی مہک لٹائیں گے
کہا خزاں سے یہ پھولوں نے مسکراتے ہوئے

مرے نصیب میں شاہینؔ ہجر ہے نہ وصال
وہ ہم سفر ہیں مگر فاصلہ بناتے ہوئے

مناظر حسن شاہینؔ
مڈل اسکول، لکشمی پور، وایا چاکند، گیا (بہار)
موبائل: 9661214111

غزل

میرے تصورات کو پیکر نہیں ملا
بن جائے جو صنم وہی پتھر نہیں ملا

پرکھا جو میں نے قدروں کی میزان پر کبھی
میں خود ہی اپنے قد کے برابر نہیں ملا

جوہر تھا خون میں کہ وہ ادنیٰ سا ایک شخص
زردارِ شہر سے کبھی جھک کر نہیں ملا

شیشے کا مرا گھر ہے سلامت کمال ہے
کیا پورے شہر میں اسے پتھر نہیں ملا

الجھے رہے کتابوں میں ہوتا رہا زیاں
ماہِ تمام جس میں ہو ساغر نہیں ملا

تھی آرزو نقوش وہ میرے سنوارتے
کاشفؔ میں کیا کروں مجھے آذر نہیں ملا

وہاج الحق کاشفؔ مرادآباد
C-61، جگر کالونی، سول لائن، مرادآباد
رابطہ: 0132-2760941

غزل

داؤں پر جان یہاں ایسے لگائے ہوئے ہیں
جیسے دشمن کے کسی ملک سے آئے ہوئے ہیں

یوں تو ہر فن میں ہر اک سمت سے چھائے ہوئے ہیں
ہم نہ ہونے کا بھی الزام اٹھائے ہوئے ہیں

تو نہیں ہے تو کوئی جاننے والا ہی نہیں
بعد مدت کے ترے شہر میں آئے ہوئے ہیں

غیر تو غیر ہیں اپنے بھی نہیں ہیں اپنے
ہم یہی سوچ کے دیوار اٹھائے ہوئے ہیں

پھول کی آس نہ پھل ہی سے غرض ہے ہم کو
شوقیہ ہم نے یہ پودے جو لگائے ہوئے ہیں

ہم تری یاد سے غافل تو نہیں ہیں لیکن
آپ اپنے کو بہرحال بھلائے ہوئے ہیں

طفل مکتب یہ غلیلوں میں مگن ہیں اب تک
خون میں اپنے کہاں خیرؔ نہائے ہوئے ہیں

رؤف خیر
9-11-137/1، موتی محل، گول کنڈہ
موبائل: 9440945645

غزل

کوئی عجب نگاہ سے کیا دیکھتا گیا
ہر تار سازِ دل کا مرے جھنجھنا گیا

بالکل بجا کہ ہے یہ اندھیرا حقیر تر
لیکن جو کل یہ محفل امکاں پہ چھا گیا

دنیا پہ ڈال دی جو اچٹتی ہوئی نگاہ
سارے جہاں کا درد مرے دل میں آ گیا

ہوش و خرد، شعور و ہنر، دست و پا تو ہیں
پھر کیا ملال جانے دو جو بھی گیا، گیا

چپکے سے آ کے خواب میں تیرا حسیں خیال
مرے تصورات کی دنیا میں چھا گیا

بس دفعتاً ذرا سی توجہ جو اس نے کی
شمسیؔ مرے وجود میں سب کچھ سما گیا

شمس الدین شمسیؔ قریشی
عثمان پور، جلالپور، امبیڈکرنگر
موبائل: 9565059506

غزل

کس لئے ماتم کریں ہم خوبیٔ تقدیر کا
منتظر ہر مسئلہ ہے ناخن تدبیر کا

دوسروں سے کیوں کہیں اس کی حفاظت کے لئے
خود تحفظ چاہئے اسلاف کی جاگیر کا

نامہ بر نے لا کے جو اس کا دیا ہے ہم کو خط
شوخ سے بھی شوخ تر ہے رنگ اس تحریر کا

خود سخن میں بولتا ہے صاحب فن کا ہنر
وہ کہاں محتاج ہوتا ہے کسی تشہیر کا

ظلم کے زنداں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا
جب صدا دینے لگا حلقہ مری زنجیر کا

دیکھئے یہ ہے زمیں غالبؔ کی اس میں دوستو!
شعر کہنا اصل میں لانا ہے جوئے شیر کا

ان کے اندازِ سخن کو ہم کہیں تو کیا کہیں
ذکر غالبؔ نے کیا ہے خود کلامِ میر کا

عبدالقیوم فرقتؔ
رسی بٹان، مولوی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9307469228

غزل

یہ طلسم شب غم ٹوٹے سحر ہی چمکے
میری آنکھوں میں کوئی بوند لہو کی چمکے

وقت کی خفتہ فضا میں ہے ضروری ہلچل
ابر احساس اٹھے درد کی بجلی چمکے

مجھ کو ظلمت میں ڈبو دے مگر اتنا کر دے
سارے عالم میں مرے خون کی سرخی چمکے

یہ دعا دی ہے مرے خون تمنا نے مجھے
تیرے ہاتھوں میں مرے پیار کی مہندی چمکے

یہ جمودِ شب غم کوئی تو اٹھ کر توڑے
کوئی جگنو کوئی دیوانہ شرر ہی چمکے

شب گزیدہ ہوں بس اتنی سی ہے خواہش کوثرؔ
صبح کے ہاتھ میں مہندی مرے خوں کی چمکے

کوثر صدیقی
زیب ولا، گنوری روڈ، بھوپال
موبائل: 9926404171

غزل

اداسی بولتی ہے صحن و در خاموش رہتے ہیں
مکیں گھر میں نہیں رہتے تو گھر خاموش رہتے ہیں

تھی زندہ جب تلک ماں رات بھر سونے نہ پاتی تھی
نہیں ہے اب تو بچے رات بھر خاموش رہتے ہیں

سنا کرتے ہیں سارا حال موجوں سے سمندر کا
صدف کے بطن میں جب تک گہر خاموش رہتے ہیں

جب ان پر آریاں چلتی ہیں چیخ اٹھتی ہیں شاخیں تک
مگر دنیا سمجھتی ہے شجر خاموش رہتے ہیں

کہاں تعریف کرتے ہیں کبھی گل اپنی خوشبو کی
ہنر خود بولتا ہے باہنر خاموش رہتے ہیں

یہی تو اصل میں پہچان ہے ان کی بصیرت کی
جب اندھے بولتے ہیں دیدہ ور خاموش رہتے ہیں

سلیقہ آ گیا ہے گفتگو کرنے کا ہم کو بھی
کوئی کچھ بھی کہے عبرتؔ مگر خاموش رہتے ہیں

عبرتؔ مچھلی شہری
محلہ خان زادہ، مچھلی شہر، جونپور
موبائل: 9565095855

غزل

سرخیاں اور ہیں اندر کی کہانی کچھ اور
اور چہرے پہ ہے تحریر، زبانی کچھ اور

آپ نے حال اس انداز سے پوچھا ہے کہ بس
بول کچھ اور ہیں لفظوں کے معانی کچھ اور

چند سکوں کی جو حاکم سے ملی ہے سوغات
جاؤ بازار تو پاؤ گے گرانی کچھ اور

پہلے بستی میں اچھالے گا کوئی چنگاری
آگ بھڑکائے گی پھر شعلہ بیانی کچھ اور

لیجئے تاج محل کر دیا میں نے مسمار
حکم آقا، ابھی باقی ہے نشانی کچھ اور

تیرے غم سے مجھے ملتی ہے جو لذت، مت پوچھ
زخم کچھ اور، مرے دشمن جانی کچھ اور

جب سے نفرت کے نشانے پہ محبت ہے شکیلؔ
آتش عشق پہ چھائی ہے جوانی کچھ اور

اعظم عباس شکیلؔ
اے۔آئی۔ایم۔ایس۔اپارٹمنٹ، میورکنج، میور وہار، دہلی
موبائل: 9717581666

غزل

کشاں کشاں ہیں مسافت میں حسرتیں دل کی
کہاں کہاں لئے پھرتی ہیں وحشتیں دل کی

کشاکشِ غمِ دوراں مفر تو لینے دے
لہو سے کیسے لکھیں ہم عبارتیں دل کی

قدم قدم پہ ہے دھوکہ فریب دنیا میں
کہاں پہ جاکے اماں پائیں چاہتیں دل کی

یہی ہے دل میں جو نفرت اُسے نکال تو دیں
گلہ کریں نہ کہیں پھر عبارتیں دل کی

عداوتوں کے شجر خوب پھلتے پھولتے ہیں
سکون دیتی ہیں دنیا کو نفرتیں دل کی

زمانہ جور و جفا کی زباں سمجھتا ہے
یہ خاک سمجھے گا معصوم نیتیں دل کی

خزاں کی شال لپیٹے ہوئے، شکستہ، شجر
یہ اُترے چہرے گلوں کے وضاحتیں دل کی

فرحت درّانی شکستہؔ
232/4، عصمت بلڈنگ، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک، لکھنؤ
موبائل: 9415758310

غزل

دوا بھی کام وہاں پر سدا نہیں آتی
جہاں کسی کے لبوں پر دعا نہیں آتی

کسی کو چوٹ لگے درد ہم کو ہوتا ہیں
وہ کیسے لوگ ہیں جن کو دَیا نہیں آتی

وفا کے واسطے اے دل ہیں امتحان بہت
دیارِ عشق میں یوں ہی وفا نہیں آتی

دہر کو چھوڑ کر جانے کی تم کو ضد کیوں ہے؟
قضا سے پہلے کسی کی قضا نہیں آتی

تمہارے دردِ جگر کی بہت دوا ہوں گی
ہمارے دردِ جگر کی دوا نہیں آتی

دعائیں دل سے کرے جو سدا بشر کے لئے
لبوں پہ اُس کے کبھی بد دعا نہیں آتی

ہماری بات کا تم کو یقیں نہیں لیکن
یہ بات سچ ہے اثرؔ کو جفا نہیں آتی

ذوالفقار حسین اثرؔ
ایم آئی جی۔ ۷، ایل ڈی اے کالونی، عیش باغ، لکھنؤ
موبائل: 9236025631

غزل

قاتل کے نام جشن چراغاں منائیں گے
مقتل کا گوشہ گوشہ لہو سے سجائیں گے

ہم سے ملا کرو نئی راہیں بتائیں گے
مرنا سکھائیں گے تمہیں جینا سکھائیں گے

اپنے تفکرات میں جو لوگ ہیں اسیر
وہ کب کسی سے کیا کوئی رشتہ نبھائیں گے

جگنو ہمارے پاس ہیں اردو زبان کے
یہ روشنی کو دنیا کا مسکن بنائیں گے

تبدیلیاں ہیں علم و عمل کے مزاج میں
بچے بھی آسمان کی باتیں بتائیں گے

ہم دورِ حاضرہ کے وہ درویش ہیں عدیمؔ
پتھریلے راستوں پہ بھی سبزہ اگائیں گے

بسم اللہ عدیمؔ برہانپوری
سنت کبیر مارگ، مہاجنہ پیٹھ، برہانپور (ایم پی)
موبائل: 9630174593

غزل

وقت کی چال پر نظر رکھو
تیغ پر، ڈھال پر نظر رکھو

تم نے ماضی پہ خوب رشک کیا
اب ذرا حال پر نظر رکھو

ہاں، سیاست کو دوش دیتے ہوئے
اپنے اعمال پر نظر رکھو

اب شکاری نہیں، شکار ہیں ہم
سوچ کر، جال پر نظر رکھو

جنگ میں قیمتی ہے ہر لمحہ
ماہ پر، سال پر ، نظر رکھو

پھل پڑوسی کے ہو نہ جائیں کہیں
اپنی ہر ڈال پر نظر رکھو

اس کی خوشبو نہ تم کو لے ڈوبے
اس کے رومال پر نظر رکھو

سلمان ظفرؔ
محلہ ناگر، قصبہ پیہانی، ضلع ہردوئی (یوپی)
موبائل: 9919911600

غزل

میری آوارہ مزاجی کو ہوا دیتی ہے
رات کچھ اور مرا درد بڑھا دیتی ہے

کوئی دستک ہے جو شب بھر نہیں سونے دیتی
کوئی آواز ہے جو نیند اڑا دیتی ہے

کوئی پیکر ہے جو احساس کو گرماتا ہے
کوئی خوشبو ہے جو جذبات جگا دیتی ہے

جانے کیا سوچ کے ہر روز میرے کمرے کا
ایک پھیرا وہ سرِ شام لگا دیتی ہے

واہمہ ہوتا ہے اس وقت ترے ہونے کا
جب ہوا چپکے سے شانوں کو ہلا دیتی ہے

جانے کیا رشتہ ہے اس کا میرے افلاس کے ساتھ
مرنا چاہوں تو وہ جینے کی دعا دیتی ہے

دے کے اکسیرؔ بشارت نئی سمتوں کی مجھے
شاعری کو میری انداز نیا دیتی ہے

محمد ہارون اکسیر
مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر)
موبائل: 9270336234

غزل

کر کے قلم فروخت قلم کار گر پڑے
قدموں پہ میر شہر کے فن کار گر پڑے

صدیوں سے جو کھڑے تھے یہاں امن کے منار
نفرت کی باد تند سے ،اس بار گر پڑے

رب کلیم ! پھر سے وہی معجزہ دکھا
فرعون کا ہر ایک فسوں کار گر پڑے

اتنا غرور ٹھیک نہیں بڑھتی مانگ پر
قیمت نہ تیری پھر سر بازار گر پڑے

آؤ پرندو! گھر پہ ہمارے بناؤ گھر
طوفاں کی چال سے سبھی اشجار گر پڑے

بیمار ماں کو چھت سے سر راہ پھینک دیں
پڑھ کر خبر یہ ہاتھ سے اخبار گر پڑے

منصور !اپنا رتبۂ بالا سنبھال رکھ
ایسا نہ ہو کہ پرچم کردار گر پڑے

منصورؔ قاسمی
نسیم شرقی ،ریاض،سعودی عرب
موبائل: 00966563670797

غزل

چھپ گیا بدلی میں الفت کا قمر لگتا ہے
اس لئے مجھ کو یہ تاریک سا گھر لگتا ہے

جانے ہو جاؤں میں کب تیری نگاہوں کا شکار
ہر قدم آگے بڑھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ایک عرصہ ہوا ملنے کو نہ آئے مجھ سے
مل گئی تجھ کو مرے دل کی خبر لگتا ہے

پھیل جاتی ہے ہر اک سمت وفا کی خوشبو
باغ میں جب کوئی الفت کا شجر لگتا ہے

روک دیتی ہے نوالے کو برابر ہچکی
ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کا اثر لگتا ہے

روٹھ جاتی ہے جب اپنی ہی محبت یارو
اجنبی ہم کو پھر اپنا ہی یہ گھر لگتا ہے

اے مشیرؔ آتی ہے اس سمت سے آہٹ کی صدا
کوئی بیٹھا ہوا گوشے میں ادھر لگتا ہے

مشیرؔ عباس مصطفوی
مصطفیٰ آباد،نگپور،جلالپور،امبیڈکرنگر
موبائل: 9793449398

تعیش بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا

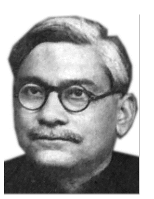

مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

’نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر‘

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان وشوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِسموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہوگیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

’دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک‘

اسی کے پیش نظر ’نیا دور‘ کے ہر شمارے میں ’گزشتہ لکھنؤ‘ کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی وتہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی بارہویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **گزشتہ لکھنؤ کی آخری بہار** سے ایک تحریر **’تعیش بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا‘** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ ’نیا دور‘ ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

دولت وثروت کی فراوانی ہر انسان کو فطری طور پر عیش پسندی اور لذت پرستی کی طرف آمادہ کر دیتی ہے۔ آج بھی صاحبان تمول کو ہم آئے دن ساقیان سیم ساق اور گل رخاں چست و چاق کی بزم آرائیوں میں عید گل اور شام نشاط رچاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن قدیم وجدید میں نمایاں فرق یہ ہے کہ عہد حاضر کی تمام کیف وسرمستی اہل دول کے لئے ہے اور غربا ومساکین یا تو نان شبینہ کو محتاج ہیں یا اپنی روکھی سوکھی روٹی کے لئے ان کو ہر روز اپنا خون پانی کرنا پڑتا ہے۔ محتاجوں اور کم مایہ لوگوں کی جو دولت مند مدد کرتے ہیں، ان کی اس خیر وخیرات میں بھی نام ونمود کی خواہش ہوتی ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ قربۃ الی اللہ کے بجائے اپنے نفس کی آسودگی کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔

فنون لطیفہ میں شعر و ادب ہو یا رقص و موسیقی، سب کے پرستار اپنی فیاضی کی شہرت کے لئے فنکاروں کی سرپرستی کرتے ہیں اور خود لذت چشم وگوش حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ عہد قدیم میں خود پرستی کا جذبہ نہیں تھا یا بہت کم تھا۔ ان کی تفریحات بھی ضروریات زندگی میں داخل تھیں اور ان کا وطیرہ یہ تھا کہ خود بھی لطف اندوز ہوں، اپنے لطف میں دوسروں کو شریک کریں اور فنکاروں کی خواہش سے زیادہ ان کی مدد کریں۔ موجودہ دور میں کسی نہ کسی نہج سے اور کسی نہ کسی گوشۂ فکر میں استحصال کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ یہ بات پرانے زمانے میں بالکل نہیں تھی جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ ہمارے اسلاف بڑے بلند حوصلہ، اولوالعزم اور وسیع النظر تھے۔ وہ متمول ضرور تھے لیکن ان میں سرمایہ دارانہ ذہنیت بالکل نہیں تھی۔ اسی لئے ان کے دل میں ہر انسان کا درد تھا اور ہر مفلوک الحال کی دست گیری کرنا اپنا انسانی فریضہ سمجھتے تھے۔

ماضی وحال کے صاحبان دولت وثروت کے طور طریقوں کا موازنہ یقینا ہمارے اسلاف کو اخلاقیات میں بلند مرتبہ ثابت کرتا ہے لیکن انسانی کردار کا ایک اور پہلو اعتدال پسندی اور عاقبت بینی بھی ہے۔ دور حاضر میں اعتدال پسندی سمٹ کر اپنی ذات تک آجاتی ہے کیونکہ دور حاضر کے اہل دولت اپنے نفس اور نام ونمود کے خواہش مند رہتے ہیں جب کہ سابق میں صورت حال اس کے برعکس تھی لیکن وہ خصوصیت جس سے ہمارے بزرگ بڑی حد تک بری تھے عاقبت بینی کی تھی۔ آج جو لوگ دولت خرچ کرتے ہیں خواہ وہ لذت نفس ہی کے لئے کیوں نہ ہو، وہ اپنی حیثیت سے زیادہ صرف نہیں کرتے یا کم سے کم اسی قدر حاصل کرنے کی پہلے سے فکر کر لیتے ہیں۔

ماضی میں یہ فکر مفقود تھی جس کے پاس جتنا سرمایہ تھا وہ اسی کو مصرف میں لاتا تھا اور اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس سرمایہ کے ختم ہو جانے کے بعد کیا ہوگا۔ دولت سے دولت جائز اور پاک

طریقوں سے بڑھائی جاسکتی تھی۔ جائداد کے منافع ہی سے جائداد میں اضافے ہو سکتے تھے لیکن یہ سب کچھ ہمارے بزرگوں نے کبھی نہیں سوچا۔ جن لوگوں نے جائدادیں خریدی تھیں انہوں نے بھی ازدیاد اولاد پر نظر نہیں رکھی اور بڑھتے ہوئے اخراجات کا لحاظ کر کے آمدنی میں کوئی تناسب قائم نہیں کیا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی معاشی یا اقتصادی پروگرام نہیں تھا۔ بے پناہ دولت تھی جس کو وہ بے تحاشا خرچ کرتے رہے اور جب وہ سرمایہ ختم ہو گیا تو ان کے کردار کی ساری کائنات بھی فنا ہو گئی۔

ان کے اس طرزِ عمل کی صفائی میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول و وراثت کا اسیر ہوتا ہے۔ اودھ کے دربار نے تعیش و شادمانی کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اسی ماحول نے کبھی کوئی ایسا موقع دیا ہی نہیں کہ وہ اپنے تعیش میں کوئی رکاوٹ لگانا ضروری سمجھتے۔

جن لوگوں نے قدیم لکھنؤ والوں کو قریب سے نہیں دیکھا اور ہماری پرانی معاشرت کا غائر مطالعہ نہیں کیا وہ ہمارے قدیم رؤسا و عمائدین کی تباہی و بربادی کے علیحدہ علیحدہ اسباب بتاتے اور تجویز کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے رئیس طوائف بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، کنکوے بازی وغیرہ و غیرہ میں تباہ ہو گئے۔ یہ الزام کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ یہ سب شوق سے پورے کرتے اور اپنی شان برقرار رکھ سکتے تھے لیکن ہوا یہ کہ ان میں تعیش دماغی کی خو پیدا ہوئی اور اس خو کی بدولت وہ جس طرف بھی بڑھتے آگے بڑھتے ہی گئے۔

ہر ذوق اور ہر شوق میں انہوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور اپنی ہر ایجاد کو معراج کمال تک پہنچایا۔ کپڑا بنوانا اور کپڑا پہننا ایک فن بن گیا تھا۔ کھانا پکوانا اور کھانا کھانا ایک زبردست فن تھا۔

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے
ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

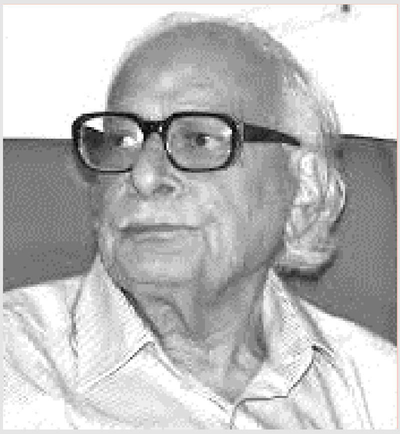

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی
فضیل جعفری بھی نہیں رہے۔
ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔
ادارہ 'نیا دور' جلد ہی فضیل جعفری کی
ادبی خدمات
پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

بٹیر بازی اور کنکوے بازی ایک دلچسپ شوق سے آگے بڑھ کر فنیت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی طوائف بازی بھی کسی جنسی خواہش کے تحت نہیں ہوتی تھی۔ طوائف بزم آرائی کا بہترین وسیلہ تھی اور بزم آرائی اور دلشادگی کا ایک فن تھا۔

رؤسا و عمائدین کے اسی تعیش دماغی کا فیض تھا کہ لکھنؤ کے فنکاروں نے صناعی کے بہترین نمونے دھاتوں اور مٹی تک کے پیدا کیے۔ ان بزرگوں کی سرپرستی صرف فنکاروں اور صناعوں تک محدود نہیں تھی بلکہ آج قدیم علم و فضل کے باقیات الصالحات بھی انہیں رئیسوں کی برکتوں سے قائم ہیں۔

انسان کا ہر رجحان خواہ وہ عیش و طرب کی طرف ہو یا محنت و مشقت کی جانب مقام اعتدال ہی میں انجام کار ہوتا ہے اور جو زیادہ زور سے دوڑنے والے کا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ وہ لوگ بہت اونچا اڑے تھے اور اسی تیز رفتاری سے مائل بہ زوال ہو گئے۔

تعیش بے تحاشا کا فطری نتیجہ اسراف بے جا تھا۔ یہ اسراف بیجا ان رؤسا و عمائدین کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا اور ان کی یہی تباہی و بربادی قدیم معاشرت کے زوال و انحطاط کا بہت بڑا سبب تھی لیکن ان عمائدین نے تباہ ہو کر اپنی گرانقدر یادگاریں بھی چھوڑی تھیں۔

ان عمارات اور خوشنما باغات کے علاوہ جن کا مثل و نظیر نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ اور ضروریات زندگی کی ہر چیز میں ایجادات و اختراعات کر کے سماج کو نفاست و نزاکت کی دولتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ جمالیاتی ذوق پیدا کر دیا تھا جس کو یاد کر کے آج بھی بہت سے لوگ سرد آہیں بھرتے ہیں۔

سب سے بڑی نعمت و دولت کردار کی بلندی اور خوش اخلاقی تھی، اخوت و محبت اور مہر و وفا کی خصلتیں تھیں جو پورے معاشرے میں داخل تھیں۔

لکھنؤ والوں کے اخلاق اور یہاں کی مصنوعات زباں زدِ خلائق تھیں۔ دنیا نے ہر خوردنی واستعمالی چیز میں ترقی کر لی ہے۔

یہاں کی مصنوعات زباں زد خلائق دوسرے مقامات پر بھی فراہم ہیں لیکن باتوں باتوں میں لکھنؤ ہی کی مقامی چیز مثالاً پیش کی جاتی ہے اور اب تک لکھنؤ کی کوئی مخصوص چیز یہاں سے بہتر کسی دوسری جگہ تیار نہیں ہوسکی۔

میرے ایک محترم دوست نے فرمایا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیاں لاجواب ہوتی ہیں لیکن ایک قلیل مدت کے بعد ہی ان کے بھائی صاحب لکھنؤ تشریف لائے تو یہاں کی ریوڑیاں سوغات میں لے گئے۔ میں نے مزاحاً استصواب کیا تو انہوں نے فرمایا:

ہاں! ہمارے یہاں بھی بہت اچھی ریوڑیاں ملتی ہیں لیکن لکھنؤ کی نفاست کہاں! جس طرح یہاں کی ریوڑی کھٹ سے بولتی ہے وہ بات ابھی تک ہمارے فنکاروں کو نہیں آئی۔

بے شمار مثالوں میں صرف ایک واقعہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ ہمارے قدیم معاشرہ نے یہاں کے لوگوں کو بے شمار خصوصیات سے سرفراز کر دیا تھا جن کو ہم بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات کے تحت برقرار نہیں رکھ سکے۔ ایسا نہ ہوتا اگر پرانے لوگوں کے اخلاق نے نئے رجحانات کے ساتھ پرانی اچھی عادتوں کو بھی ٹھکرایا نہ ہوتا لیکن وہ مجبور بھی تھے۔ معاشی واقتصادی دفعتہ اتنی تیزی سے بدلے کہ بیسویں صدی کے اوائل والی نسل حواس باختہ ہو کر رہ گئی تھی۔

اس دارِفانی میں صرف حکومتوں پر زوال نہیں آتا بلکہ معاشروں کی بھی ہیئت بدلتی ہے۔ یہی نہیں کہ پورا کلچر فنا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یونان، روم، بابل وغیرہ وغیرہ کے معاشرتی نظاموں کی تاریخیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

> سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار
> کہ سرنوشت لکھی ہے مری بہ خطِ غبار
>
> مرزا محمد رفیع سوداؔ
>
> قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور اس کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دورِ حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امروہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تئیں نئی نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیا دور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔ (ایڈیٹر)

اخلاقی اور مادی قدریں بدل گئیں تو لکھنؤ کی قدیم تہذیب بھی فنا ہو گئی لیکن تاریخ کا یہ سبق ہے کہ ہم کو ماضی سے افادیت حاصل کرنا چاہئے اور جو طور طریقے، رسم و رواج، رہن سہن ہمارے ملکی، جغرافیائی اور وراثتی حالات کے تحت کارآمد ہوں ان کی طرف پھر رجوع ہونا دانشمندی کا تقاضا ہے۔

ہم قدامت پرستی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کرتے البتہ اگر قدیم میں انسانیت و شرافت، تہذیب و اخلاق اور مہر و وفا کی نادر المثال نظیریں ملتی ہیں تو ان کی تاسی کرنا نہ صرف آج بلکہ ہر دور میں مناسب اور سودمند ہوگا۔ ہمارے آبا و اجداد کی معاشرت کا 'پہلے آپ، پہلے آپ' کہہ کر مذاق اڑانے والوں کو ان کی نرم گفتاری، سبک خرامی اور منکسر المزاجی کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔

یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ کلمہ بڑے سے بڑا دولت مند اپنے غریب سے غریب ہم سفر اور رفیق کو بھی مخاطب کر کے کہتا تھا۔ کیا اس طرزِ عمل میں انسانیت اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نہیں تھی۔

بہرحال وہ دور ختم ہوگیا اور غالباً راقم کے علاوہ کوئی اس معاشرے کا پرستار اور اس کی کوئی یادگار اب باقی نہیں ہے اور اگر کسی گوشہ میں کوئی مل جائے تو اس کا عدم اور وجود برابر ہوگا لیکن یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ دورِ حاضر کی معاشرت سابقہ تہذیب کے مقابلہ میں بہت کمزور بنیادوں پر قائم ہے۔ معاشیات و اقتصادیات بہت سرعت کے ساتھ بنتے اور بگڑتے ہیں لہٰذا ہم کو اخلاقیات و وجدانیات سے بھی منسلک رہنا چاہئے۔ آئندہ جو زمانہ دکھائے گا وہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ راقم اپنی یہ گفتگو صرف اس دعا پر ختم کرتا ہے:

السلام اے بعد ما آئندگان رفتنی
برشما خوش باش ناخوش ہائے دنیائے دنی

□□□

دوپہر کا کھانا

امرکانت

۱۹۲۵ء ۲۰۱۴ء

سدھیشوری نے کھانا کھانے کے بعد چولہا بجھا دیا اور دونوں گھٹنوں کے درمیان سر رکھ کر شاید پیر کی انگلیاں یا زمین پر چلتی ہوئی چیونٹیوں کو تکنے لگی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ کافی دیر سے اسے پیاس نہیں لگی ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح اٹھی اور گھڑے سے لوٹا بھر پانی چڑھا گئی۔ خالی پیٹ پانی اس کے پیٹ میں جا لگ اور وہ ہائے رام کہہ کر وہیں زمین پر دراز ہوگئی۔

آدھے گھنٹے کے بعد اس کی حالت میں تبدیلی آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ادھر ادھر دیکھا اور اس کی نظر برآمدے میں ٹوٹی چارپائی پر سوئے ہوئے اپنے چھ سالہ لڑکے پرمود پر جم گئی۔

لڑکے کے گلے اور سینے کی ہڈیاں صاف ظاہر تھیں۔ ہاتھ پیر باسی ککڑیوں کی طرح بے جان اور پیٹ ہنڈیا کی طرح پھولا ہوا تھا۔ منھ کھلا ہوا تھا اور لا تعداد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

وہ اٹھی اور بچے کے منھ پر ایک مٹمیلا سا کپڑا ڈال دیا۔ کچھ لمحہ اسے تکنے کے بعد دروازہ کی آڑ سے گلی کی جانب دیکھنے لگی۔ بارہ بجنے کو تھے۔ دھوپ شدید تھی۔ کچھ وقفہ پر دو ایک لوگ تولیہ یا انگ رکھا سر پر رکھے ہوئے تیزی سے گزرتے ہوئے نظر آجاتے۔ دس پندرہ منٹ وہ اسی طرح کھڑی رہی پھر چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھریں اور اس نے آسمان کی طرف نظر کی۔ اس نے سر دروازے سے باہر نکال کر گلی کی طرف جھانکا تو اس کا بڑا لڑکا رام چندر آہستہ آہستہ اس کی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔

اس نے تیزی سے ایک لوٹا پانی بھر کے برآمدے کی چوکی کے پاس رکھ دیا۔ وہ پانی رکھ کر گھومی ہی تھی کہ رام چندر نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ رام چندر دھم سے چارپائی پر آ گرا۔ گرمی سے چہرا لال اور بال بکھرے ہوئے تھے اور پھٹے پرانے جوتوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔

> ہندی زبان کے معروف ادیب، ناول نگار اور افسانہ نویس امرکانت کے نو ناول اور دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ متعدد ملکی و غیر ملکی ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۲۰۰۷ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ۲۰۰۹ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی انہیں سرفراز کیا گیا۔ 'سوکھا پتہ'، 'بیچ کی دیوار'، 'کٹیلی راہ کے پھول' وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ پیش ہے ان کی کہانی **'دوپہر کا کھانا'** جس کا اردو ترجمہ **'مسرت فاطمہ'** نے کیا ہے۔

سدھیشوری کی پہلے تو اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ دور ہی سے اس کی جانب تکتی رہی لیکن دس پندرہ منٹ گزرنے کے بعد بھی جب وہ بستر سے نہیں اٹھا تو وہ گھبرا گئی۔ پاس جا کر آواز دی: بڑکو! بڑکو! لیکن جواب نہ ملنے پر ڈر گئی اور لڑکے کی ناک کے پاس ہاتھ رکھا۔ سانس چل رہی تھی۔ سر پر ہاتھ رکھا، بخار نہیں تھا۔ ہاتھ کے لمس کے ساتھ ہی رام چندر نے آنکھ کھول دی۔ پہلے تو اس نے ماں کو سست نظروں سے دیکھا پھر اچانک اٹھ بیٹھا۔ جوتے اتارنے اور ہاتھ پیر دھونے کے بعد وہ مشین کی طرح چوکی پر آکر بیٹھ گیا۔

سدھیشوری نے ڈرتے ہوئے پوچھا: کھانا تیار ہے، یہیں لگاؤں کیا۔

رام چندر نے اٹھتے ہوئے سوال کیا: بابو جی کھا چکے؟ سدھیشوری نے جواب دیا: آتے ہی ہوں گے۔

رام چندر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تقریباً اکیس برس تھی۔ لمبا قد، دبلا پتلا، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹو پر جھریاں۔

سدھیشوری نے کھانے کی پلیٹ سامنے لا کر رکھ دی اور قریب ہی بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگی۔ اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ کل دو روٹیاں، کٹورا بھر کر پانی کی طرح دال اور چنے کی تلی سبزی۔

رام چندر نے پہلے لقمہ کو کھاتے ہی پوچھا، موہن کہاں ہے؟ بہت دھوپ ہو رہی ہے۔

موہن سدھیشوری کا منجھلا لڑکا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا اور ہائی اسکول میں پرائیوٹ امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ نہ معلوم کب سے گھر سے غائب تھا اور خود سدھیشوری کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

لیکن سچ بول نہ سکی اور اس نے جھوٹ کہا: کسی لڑکے کے یہاں پڑھنے گیا ہے، آتا ہی ہوگا۔ دماغ کا تیز ہے۔ چوبیس گھنٹے پڑھائی ہی میں لگا رہتا ہے اور ہمیشہ پڑھائی ہی کی بات کرتا ہے۔

رام چندر نے خاموشی اختیار کی۔ ایک لقمہ کھایا اور گلاس بھر کے پانی پیا۔ وہ کافی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھا رہا تھا۔

سدھیشوری اس کی طرف خوف سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحہ گزرنے کے بعد اس نے پوچھ ہی لیا، وہاں کچھ ہوا کیا؟

رام چندر نے نظر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا پھر نظریں نیچی کیں اور بولا: وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سدھیشوری چپ ہوگئی۔ دھوپ شدت اختیار کر رہی تھی۔ آسمان میں بادل کے ایک دو ٹکڑے گھوم رہے تھے۔ باہر کی گلی سے گزرتے ہوئے کھڑکھڑیا اِکّے کی آواز آ رہی تھی اور کھٹولے پر سوئی ہوئے لڑکے کی سانس کی آواز آ رہی تھی۔

اچانک رام چندر نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا: پرمود کھا چکا؟ سدھیشوری نے مایوسی سے جواب دیا: ہاں، کھا یا چکا۔

’رویا تو نہیں تھا؟‘

سدھیشوری جھوٹ بول گئی۔ ’آج تو بالکل نہیں رویا۔ بہت ہوشیار ہوگیا۔ کہہ رہا تھا۔ بڑکا بھیا کے یہاں جاؤں گا۔ وہ لڑکا....

وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔ جیسے گلے میں کچھ اٹک گیا ہو۔ پرمود ریوڑی کھانے کی ضد کر رہا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سو یا تھا۔

رام چندر نے تعجب سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر تیزی سے کھانا کھانے لگا۔

جب روٹی کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا تو سدھیشوری نے کہا:

’ٹھہرو! ایک روٹی اور لاتی ہوں۔‘

’نہیں، ذرا بھی نہیں، پیٹ پہلے ہی بھر چکا ہے۔ میں تو یہ بھی چھوڑنے والا ہوں۔ بس اب نہیں۔‘

سدھیشوری نے ضد کی، ’اچھا آدھی ہی صحیح‘

رام چندر ناراض ہو گیا۔ ’زیادہ کھلا کر بیمار کرنے پر کیوں تلی ہیں آپ۔ ذرا بھی نہیں سوچتی۔ بس اپنی ضد۔ بھوک ہوتا تو کیا کھا تا نہیں؟‘

سدھیشوری وہیں بیٹھی رہ گئی۔ رام چندر نے بچی ہوئی روٹی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بولا: ’پانی لاؤ‘۔

سدھیشوری لوٹا لے کر پانی لینے چلی گئی۔ رام چندر نے کٹورے کو انگلیوں سے بجایا پھر تھالی میں ہاتھ رکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد باقی بچے ہوئے ٹکڑے کو بھی منہ میں رکھ لیا جیسے وہ کھانا نہ ہوکر پان کا ایک بیڑا ہو۔

مجتبیٰ حسین

اپنی مزاحیہ تحریروں اور طنزیہ جملوں سے ذہن کے دریچوں کو وا کر دینے میں طاق مجتبیٰ حسین کو ہندوستانی طنز و مزاح کا شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ اردو ہی کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ان جیسا مزاح نگار شاید کوئی دوسرا نہیں۔

ادارہ ’نیا دور‘ جلد ہی مجتبیٰ حسین سے طویل انٹرویو کے ساتھ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی عظمت پر بھرپور مواد کے ساتھ آپ کے روبرو ہوگا۔

منجھلا لڑکا موہن آتے ہی ہاتھ پیر دھو کر بیٹھ گیا۔ سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھ، چہرے پر چیچک کے داغ، اپنے بھائی کی طرح دبلا لیکن قد لمبا نہیں تھا۔ وہ اپنی عمر کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ اور مایوس دکھائی دے رہا تھا۔

سدھیشوری نے تھالی رکھتے ہوئے سوال کیا: کہاں گئے تھے بیٹا! بھیا پوچھ رہا تھا؟

موہن ایک بڑے سے نوالے کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: کہیں تو نہیں، یہیں پر تو تھا۔

سدھیشوری وہیں بیٹھی پنکھا جھلتی ہوئی خود سے باتیں کرنے لگی، بڑکا تمہاری بڑی تعریف کر رہا تھا۔ موہن کا دماغ تیز ہے، اس کی طبیعت پڑھائی میں ہی لگی رہتی ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنے منجھلے لڑکے کی طرف ایسے دیکھا جیسے کچھ چرا رہی ہو۔

موہن اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا۔ پھر کھانے میں جٹ گیا۔ وہ اپنا تقریباً آدھا کھانا کھا چکا تھا۔

سدھیشوری کو اپنے دونوں لڑکوں سے ڈر لگتا تھا۔ اچانک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے موہن کی طرف دیکھا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا:

’رکو! ایک روٹی اور دیتی ہوں۔‘

موہن نے باورچی خانہ کی جانب عجیب نظروں سے دیکھا پھر بولا، نہیں۔ رہنے دیجئے۔

سدھیشوری نے گڑگڑاتے ہوئے کہا، تمہیں میری قسم! تھوڑی ہی لے لو، تمہارے بھیا نے ایک روٹی اور کھائی تھی۔

موہن نے اپنی ماں کی طرف غور سے دیکھا پھر آہستہ آہستہ ایسے جواب دیا جیسے کوئی استاد اپنے طالب علم کو سمجھاتا ہے۔ ’نہیں رے، بس! اول تو بھوک نہیں ہے۔ پھر روٹیاں تو نے ایسی بنائی ہیں کہ کھائی نہیں جاتیں۔ نہ معلوم کیسی لگ رہی ہیں۔ خیر اگر تو چاہتی ہے تو کٹورے میں تھوڑی سی دال دے دے، دال اچھی بنی ہے۔‘

سدھیشوری سے کچھ کہتے نہ بنا اور اس نے کٹورے کو دال سے بھر دیا۔

موہن نے کٹورا منہ سے لگا ہی تھا کہ منشی

پرساد کے جوتوں کی آواز آنے لگی۔ وہ آئے اور چارپائی پر دراز ہوگئے۔ سدھیشوری نے آنچل برابر کیا اور موہن ایک ہی سانس میں دال ختم کر ہاتھ دھونے تیزی سے باہر چلا گیا۔

رو روٹیاں، کٹوری بھر دال اور چنے کی تلی سبزی، منشی چندرکا پرساد پالتھی مار کر ایسے کھانا چبانے لگا جیسے گائے جگالی کرتی ہے۔ پینتالیس کے قریب عمر تھی لیکن پچاس پچپن کے نظر آتے تھے۔ جسم پر جھریاں تھیں۔ سر کے بال غائب ہو چکے تھے۔ گندی سے تہمد پر قدرے صاف بنیان لٹک رہی تھی۔

منشی جی نے کٹورے کی دال پیتے ہوئے پوچھا: بڑکا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

سدھیشوری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے دل میں کیا ہو گیا ہے۔ جیسے کچھ کاٹ رہا ہو۔ پنکھے کو ذرا زور سے گھماتے ہوئے بولی، ابھی ابھی کھا کر کام پر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کچھ دنوں میں نوکری لگ جائے گی۔ ہمیشہ بابوجی بابوجی کیا کرتا ہے۔ بولا، بابوجی دیوتا سمان ہیں۔

منشی جی کے چہرے پر چمک آگئی۔ شرماتے ہوئے بولے، ایسا کیا کہتا ہے کہ دیوتا سمان ہوں، بڑا پاگل ہے۔

سدھیشوری جیسے نشے کی حالت میں بڑبڑانے لگی۔ 'پاگل نہیں، بڑا ہوشیار ہے، اس زمانے کا کوئی مہاتما ہے، موہن تو اس کی بڑی عزت کرتا ہے۔ آج کہہ رہا تھا کہ بھیا کی شہر میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے والوں کا احترام کیا جاتا ہے اور بڑکا تو چھوٹے بھائیوں پر جان دیتا ہے۔ وہ دنیا میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن یہ نہیں کہ پرمود کو کچھ ہو جائے۔'

منشی جی دال لگے ہاتھ چاٹ رہے تھے۔ انہوں نے طاق کی جانب دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا، 'بڑکے کا دماغ تو کافی تیز ہے، ویسے لڑکپن میں بھی نٹ کھٹ تھا۔ ہمیشہ کھیل کود میں لگا رہتا تھا لیکن یہ بھی بات تھی جو سبق میں اسے یاد کرنے کو دیتا تھا، وہ مکمل رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ تینوں لڑکے کافی ہوشیار ہیں۔ پرمود کو کم سمجھتی ہو؟' یہ کہہ کر منشی جی ہنس پڑے۔

منشی جی نے ڈیڑھ روٹی کھانے کے بعد ایک گلاس پانی پیا اور ایک دم سے کھانسنے لگے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ دور سے کسی آٹے کی چکی کے چلنے کی آواز آرہی تھی اور قریب کی نیم کے پیڑ پر بیٹھا کوئی پرندہ آواز لگا رہا تھا۔

سدھیشوری کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ سبھی چیزیں ٹھیک سے پوچھ لے اور دنیا کی ہر چیز پر پہلے کی طرح کھل کر بات کرے لیکن ہمت جواب دے چکی تھی۔ نہ جانے کس چیز کا خوف سمایا ہوا تھا۔

اب منشی جی اس طرح دیکھے ہوئے کھا رہے تھے جیسے گزشتہ دو تین دنوں سے چپ کا ورت رکھا ہو اور آج شام کو توڑنے والے ہوں۔

سدھیشوری سے جیسے رہا نہیں گیا۔ بولی، معلوم ہوتا ہے، اب بارش نہیں ہوگی۔

منشی جی نے لمحہ بھر کے لئے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک دم بولے، مکھیاں بہت ہوگئی ہیں۔

سدھیشوری بولی، پھوپھا جی بیمار ہیں، کوئی خبر بھی نہیں آئی۔

منشی جی نے چنے کی دانوں کی طرف ایسے دیکھا جیسے ان سے بات کرنے والے ہوں۔ پھر خبر دی، گنگا شرن بابو کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی ہے، لڑکا ایم اے پاس ہے۔

سدھیشوری خاموش ہوگئی۔ منشی جی بھی کچھ نہیں بولے۔ ان کا کھانا ختم ہو گیا تھا۔ وہ تھالی میں بچے کھچے چنے کے دانے تلاش رہے تھے۔

سدھیشوری بولی، بڑکا کی قسم! ایک روٹی دیتی ہوں، کھا لیجئے۔ ابھی بہت سی ہیں۔

منشی جی نے بیوی کی جانب مجرم کی طرح اور باورچی خانے کی جانب ترچھی نظروں سے دیکھا اس کے بعد کسی چھوٹے استاد کی طرح بولے، پیٹ کافی بھر چکا ہے۔ اناج اور نمکین چیزوں سے طبیعت اوب گئی ہے۔ تم فالتو میں قسم دے رہی ہو۔ خیر قسم رکھنے کے لئے لے رہا ہوں، گُڑ ہوگا کیا؟

'ہنڈیا میں تھوڑا سا ہے۔' سدھیشوری بولی۔

منشی جی نے کہا، 'تھوڑے گُڑ کا ٹھنڈا رس بناؤ۔ میں پیوں گا۔ تمہاری قسم بھی رہ جائے گی۔ ذائقہ بھی بدل جائے گا اور ہاضمہ بھی درست ہو جائے گا۔ روٹی کھاتے کھاتے ناک میں دم ہو گیا ہے۔' یہ کہہ کر انہوں نے قہقہہ لگایا۔

منشی جی کے کھانے کے بعد سدھیشوری ان کی تھالی لے کر چوکے کی زمین پر بیٹھ گئی۔ پتیلی کی دال کٹورے میں انڈیل دی لیکن وہ پورا بھرا نہیں۔ تھوڑی چنے کی سبزی بچی ہوئی تھی۔ اسے الگ رکھ لیا، روٹیوں کی تھالی کو بھی الگ رکھ لیا۔ صرف ایک روٹی بچی تھی۔ موٹی، جلی اور بھدی سی، جسے وہ اسی تھالی میں رکھنے جا رہی تھی کہ اچانک اس کی توجہ برآمدے میں سوتے ہوئے پرمود کی طرف گئی۔ اس نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا پھر روٹی کے دو ٹکڑے کر دئے۔ ایک ٹکڑے کو الگ رکھ کر دوسرے کو اسی تھالی میں رکھ دیا۔ اس کے بعد لوٹا اور پانی لے کر کھانے بیٹھ گئی۔ اس نے پہلا لقمہ منھ میں رکھا اور نہ جانے کیسے اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگے۔

سارا گھر مکھیوں سے بھن بھن کر رہا تھا۔ آنگن کی الگنی پر ایک گندی سی، پیوند لگی ہوئی ساڑی ٹنگی تھی۔ دونوں بڑے لڑکوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ باہر کی کوٹھری میں منشی جی اوندھے منھ بےفکری کی نیند سو چکے تھے جیسے ڈیڑھ مہینے قبل سرکاری مکان کے کرائے کے محکمہ میں کلرکی سے ان کی چھٹی نہ ہوئی ہو اور شام کو ان کو کام کی تلاش میں کہیں جانا نہ ہو۔

□□□

شینوا اچیبے

۱۹۳۰ء ۲۰۱۳ء

امن کے بعد

جوناتھن اوِگبوا اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت محسوس کرتا تھا۔ نئے نئے قائم ہونے والے امن کے ان دھندلے دھندلے سے دنوں میں پرانے دوستوں میں ایک دوسرے کو ''زندگی مبارک ہو'' کہہ کر مبارک باد دینے کا چلن تھا......لیکن اس کے لیے یہ محض مبارکبادی کا جملہ نہ تھا، بلکہ بہت کچھ تھا...... یہ جملہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ جنگ کے آتشیں ماحول سے وہ پانچ بیش بہا چیزیں بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ ان میں سے ایک تھا اس کا اپنا سر، ایک اپنی بیوی ماریا کا سر اور اپنے چار میں سے تین بیٹوں کے سر۔ یہی نہیں اضافی بونس کے طور پر وہ اپنی پرانی سائکل بھی بچانے میں کامیاب رہا تھا، جس کا بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا، بہر حال جو بھی ہو...... پانچ انسانی سروں سے تو اس کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس سائکل کی بھی اپنی الگ ہی کہانی تھی۔ ان دنوں جنگ زوروں پر تھی، اچانک ایک دن اس سے ''ضروری فوجی کاروائی'' کے لیے اس کی سائکل طلب کر لی گئی۔ حالاں کہ سائکل سے دستبردار ہونا اس کے لیے بہت ہی مشکل امر تھا پھر بھی وہ بلا جھجک سائکل ان کے حوالے کر ہی دیتا لیکن نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ اس فوجی افسر سے اپنی سائکل بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ایسا اس لیے نہیں تھا کہ اس فوجی افسر کی وردی بوسیدہ تھی، نہ ہی اس لیے کہ اس کے ایک پیر میں نیلا اور دوسرے پیر میں بھورا کینوس کا جوتا تھا جن سے اس کے پیروں کی انگلیاں جھانک رہی تھیں، اور نہ ہی اس لیے کہ اس کے عہدے کو ظاہر کرنے والے دونوں ستارے شاید بڑی جلدی میں بال پین سے بنائے گئے تھے۔ ان دنوں بے شمار اچھے اور بہادر فوجیوں کی حالت ویسی ہی یا اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ تو اس فوجی کے انداز اور لہجے کی کمزوری تھی جس نے اسے ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

نائیجیریا کے مشہور ادیب و شاعر شینوا لوموگو اچیبے کی متعدد ناولیں اور دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں مین بُکر انٹرنیشنل انعام سے نوازے گئے۔ ان کے پہلے ناول 'تھنگس فال اپارٹ' نے زبردست کامیابی حاصل کی اور اب تک دنیا کی تقریباً 50 زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'گرلز ایٹ وار' شائع ہوکر بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'امن کے بعد' جس کا اردو ترجمہ **'محمد سرور رضوی'** نے کیا ہے۔

اسے لگا جیسے وہ اس فوجی افسر سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ پس جوناتھن نے اپنے رافیا کے ریشوں سے بنے تھیلے میں تلاش کر کے دو پونڈ کے نوٹ نکالے اور اسے دے دیے۔ یہ رقم لے کر وہ جلاون کی لکڑیاں خریدنے نکلا تھا۔ اس کی بیوی ماریا یہ لکڑیاں فوجیوں کو فروخت کر کے کچھ آمدنی کر لیتی تھی تاکہ کچھ اضافی خشک مچھلی اور مکئی کی بنی غذا خرید سکے۔ بہر حال وہ اپنی سائکل بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی رات اس نے اپنی سائکل جھاڑیوں کے درمیان کی اسی چھوٹی سی خالی جگہ میں دفن کر دی، جہاں کیمپ کے دوسرے مردوں کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا بھی دفن تھا۔ ایک سال بعد جب جنگ ختم ہوئی اور اس نے زمین کھود کر اسے باہر نکالا تو یہ بالکل صحیح سلامت تھی، بس ذرا سی پام آئل ڈالتے ہی پھر سے قابل استعمال بن گئی۔ ''خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں'' اس نے حیرت سے کہا تھا۔

اس نے سائکل کا ایک بہتر استعمال ڈھونڈ لیا۔ اس نے اسے ٹیکسی کے بہ طور استعمال کر کے خاصی رقم کمالی۔ وہ فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کو قریبی پکی سڑک، جو وہاں سے چار میل کے فاصلے پر تھی، پہنچا دیتا تھا۔ اس کے لیے وہ عام طور سے چھ پونڈ (بیافرائی کرنسی) کرایہ لیتا تھا اور جن لوگوں کے پاس رقم تھی وہ اس کا کچھ حصہ اس طرح خرچ کر کے خوش ہوتے تھے۔ دو ہفتوں ہی میں اس نے ایک سو پندرہ پونڈ جمع کر لیے جو اس کے لیے ایک خزانے سے کم نہ تھے۔

پھر ایک دن وہ اپنے شہر اینوگو واپس گیا تو وہاں ایک اور معجزہ اس کا منتظر تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر دوبارہ دیکھا......ہاں! وہ اس کے سامنے صحیح سلامت کھڑا تھا......لیکن پھر بھی یہ معجزہ اس کے خاندان کے پانچ سَروں کی سلامتی کے مقابلے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

یہ نیا معجزہ اُوگوئی اُوور سائڈ پر واقع اس کا چھوٹا سا مکان تھا...... بے شک! خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں! اس

سے صرف دو مکان آ گئے، ایک کنکریٹ کا بنا بہت بڑا اور شاندار مکان، جو ایک دولتمند ٹھیکے دار نے لڑائی چھڑنے سے چند دنوں قبل ہی بنوایا تھا، آج ملبے کا پہاڑ بنا پڑا تھا، اور وہیں جوناتھن کا جستے کی چادروں سے بنا مکان جس کی تعمیر میں مٹی کی کچی اینٹیں بھی استعمال کی گئی تھیں صحیح سلامت تھا۔ بے شک دروازے اور کھڑکیاں غائب تھیں اور چھت کی پانچ چادریں بھی نہیں تھیں، لیکن یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ ایبو گو بالکل صحیح وقت پر لوٹا تھا اور آس پاس بکھرے ملبے میں سے جستے کی چادریں، لکڑیاں اور کارڈ بورڈ کے ٹکڑے چن سکتا تھا، اس سے قبل کہ ہزاروں لوگ اپنی جنگی پناہ گاہوں سے باہر نکل کر آتے اور یہی چیزیں تلاش کرتے پھرتے۔ اس نے ایک مفلوک الحال بڑھئی کو بھی ڈھونڈ نکالا جس کے اوزاروں والے تھیلے میں صرف ایک ہتھوڑی، ایک کند آری اور چند زنگ آلود، مڑی تڑی کیلیں ہی باقی بچی تھیں۔ وہ پانچ نائجیر یائی شیلینگ یا پچاس بیافرائی پونڈ کے عوض لکڑی، جستے اور کارڈ بورڈ سے، جو جوناتھن چن کر لا یا تھا، دروازے اور کھڑکیاں بنانے پر راضی ہو گیا۔ جوناتھن نے پونڈ اسے ادا کر دیے اور خوشی سے پاگل اپنے خاندان کے پانچ افراد کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔

نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرنے کے لیے، اس کے بچے قریبی فوجی قبرستان سے آم توڑ کر فوجیوں کی بیویوں کو چند سکوں کے عوض فروخت کرنے لگے۔ اس کی بیوی پڑوس کے لوگوں کو فروخت کرنے کے لیے اَکارا بال (ایک نائجیریائی فاسٹ فوڈ ڈِش) بنانے لگی۔ جوناتھن اپنی سائکل پر آس پاس کے گاؤں سے تازہ تاڑی (تاڑ کی بنی شراب) خرید کر لاتا اور سڑک کے کنارے واقع نل سے، جس میں حال ہی میں پھر سے پانی آنا شروع ہوا تھا، پانی لاکر، تاڑی میں اچھی خاصی مقدار میں ملاتا۔ اس نے فوجیوں اور لڑائی میں زندہ بچ جانے والے خوش نصیب اور دولتمند لوگوں کے لیے ایک شراب خانہ کھول لیا تھا۔

کول کارپوریشن کے آفس میں، جہاں وہ پہلے کان کُن کے طور پر کام کرتا تھا، وہ بار بار جایا کرتا تھا، شروع شروع میں روزانہ، پھر ہر دوسرے دن اور پھر ہفتے میں ایک دن، تاکہ اسے نوکری کی بحالی کی کوئی خبر مل سکے۔ آخر کار جو بات اس کی سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ اس کے مکان کا صحیح سلامت بچ جانا اس سے کہیں زیادہ بڑی خوش بختی تھی جتنی وہ سمجھ رہا تھا ...... اس کے کچھ ساتھی کان کُن، جنھیں کوئی ٹھکانہ میسر نہیں تھا وہ دن بھر کے انتظار کے بعد، آفس کے دروازوں کے باہر ہی بورن ویٹا کے ٹن کے ڈبوں میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی کھانے کی چیز پکا لیتے اور وہیں زمین پر سو جاتے۔ انتظار جب بہت طویل ہو گیا اور اس بات کی پھر بھی کوئی خبر نہ ملی کہ نوکری کا کیا ہوگا، تو اس نے ہر ہفتے آفس جانے کا اپنا معمول ختم کر دیا اور سنجیدگی سے اپنے شراب خانے میں دلچسپی لینے لگا۔

لیکن خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں! قسمت اس پر مہربان تھی۔ ٹریزری آفس کے سامنے، تیز دھوپ میں، پانچ دن تک قطاروں میں لگنے کے بعد، آخر اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بیس پونڈ کے نوٹوں کو گنا، جو اسے 'ایکس گریشیا' (Ex-gratia) انعام کے طور پر ملے تھے۔ جب رقم بٹنے لگی تو اس کے اور اس جیسے دوسروں کے لیے یہ ساں کرسمس سے کم نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ اسے ایگ ریشر کہا کرتے تھے کیوں کہ وہ اس کا صحیح تلفظ (ایکس گریشیا) ادا نہیں کر پاتے تھے۔

جیسے ہی پونڈ کے نوٹ اس کی ہتھیلی پر آئے اس نے فوراً سختی سے اپنی مٹھی بند کر لی اور پھر مٹھی کو اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھا، کیوں کہ ابھی دو دن قبل ہی اس نے ایک آدمی کو اس جم غفیر کے سامنے بری طرح پچھاڑیں کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بے چارے کو جیسے ہی بیس پونڈ ملے، ویسے ہی کسی بے رحم جیب کترے نے اس کی جیب سے اڑا لیے تھے۔ اب ایک آدمی جس کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو چکا ہو، اسے کوئی الزام دینا کسی طرح مناسب نہ تھا، لیکن پھر بھی لوگ اس آدمی ہی کو اس کی لاپروائی کے لیے کوس رہے تھے، خاص طور سے جب اس نے اپنی جیب کو الٹ کر باہر نکالا تو اس میں ایک اتنا بڑا سوراخ موجود تھا جس میں سے ایک چور کا ہاتھ بڑی آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بضد تھا کہ رقم اس جیب میں نہیں دوسری جیب میں تھی، اس نے وہ جیب بھی باہر نکال کر دکھائی جو بالکل ٹھیک تھی...... بہر حال ہر شخص کو محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

جلد ہی جوناتھن نے رقم بائیں ہاتھ میں لے کر پینٹ کی بائیں جیب میں ڈال لی، تاکہ ضرورت پڑنے پر، اس کا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے خالی رہے۔ حالاں کہ اس نے اپنی نگاہیں انسانی چہروں سے اوپر ایک ایسے زاویے پر ٹکا رکھیں تھیں کہ اسے یقین تھا کہ گھر پہنچنے تک اسے کسی سے مصافحہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

عام طور سے وہ بہت گہری نیند سویا کرتا تھا لیکن اس رات اس نے پاس پڑوس کی ساری آوازوں کو، ایک کے بعد ایک، رات کے سناٹے میں ڈوبتے ہوئے سنا۔ یہاں تک کہ رات کا چوکیدار، جو ہر گھنٹے دور کسی دھاتی شئے کو بجایا کرتا تھا، وہ بھی شاید ایک کا گھنٹہ بجانے کے بعد کہیں سو گیا تھا۔ جوناتھن یہی سوچتے سوچتے آخر خود بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ابھی اسے سوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

''کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟'' اس کی بیوی نے سرگوشی کی، جو زمین پر اس کی بغل میں لیٹی ہوئی تھی۔

''مجھے پتا نہیں۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ دوسری بار ہونے والی دستک زیادہ تیز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمزور سا دروازہ گر پڑے گا۔'' کون

ہے؟'' اس نے پوچھا، اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''ہم چور ہیں۔ دروازہ کھولو۔'' باہر سے جواب ملا اور ساتھ ہی زوردار آواز میں دروازہ پیٹا گیا۔

اس کی بیوی ماریا نے سب سے پہلے چیخنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ اس کے سبھی بچے بھی چیخنے لگے۔

''چور...... چور...... پولیس! ...... پڑوسیو! ...... ہمیں بچاؤ...... چور آئے ہیں...... ہم لٹ جائیں گے ...... ہم برباد ہو جائیں گے...... پڑوسیو!...... تم لوگ سو رہے ہو...... جاگو...... ہمیں بچاؤ...... پولیس......۔''

کافی دیر تک وہ لوگ چیختے رہے۔ پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ شاید انھوں نے چوروں کو ڈر کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مکمل سناٹا طاری تھا، لیکن بہت کم وقت کے لیے۔

''چیخنا چلانا ہو گیا؟'' باہر سے آواز آئی، ''یا ہم بھی تمھاری تھوڑی مدد کر دیں؟''

اور پھر چور خود ہی چیخنے لگے ''اے لوگو...... چور، چور...... پولیس!...... پڑوسیو!...... ہم لٹ جائیں گے ...... ہم برباد ہو جائیں گے، ہمیں بچاؤ...... پولیس......''

سرغنہ کے علاوہ کم از کم پانچ دوسری آوازیں بھی اس خوفناک کورَس میں شامل تھیں۔

جوناتھن اور اس کے خاندان کا خوف سے برا حال تھا۔ ماریا اور اس کے بچے بری طرح بے آواز رو رہے تھے۔ جوناتھن لگاتار کراہے جا رہا تھا۔ اس کے پیر اس کے اپنے بوجھ تلے بری طرح کپکپا رہے تھے۔

چوروں کے چیخنے کے بعد کا سناٹا بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ جوناتھن ان کے سرغنہ سے منتیں کرنے لگا کہ وہ اسے بخش دے، اس کے پاس انھیں دینے کے لیے کچھ نہیں۔

''سنو میرے دوست۔'' آخر چوروں کے سرغنہ نے کہا، ''ہم برے نہیں ہیں۔ ہم کسی کو بے کار ستانا نہیں چاہتے۔ مشکلات کا دور ختم ہو گیا ہے۔ لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ اب خانہ جنگی پھر نہیں ہوگی۔ اب امن کا دور ہے۔ ہے یا نہیں؟''

''ہاں ہے۔'' اس کے ساتھیوں نے ایک ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں ایک بے حد غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ جنگ کی نذر ہو گیا۔ تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟ تمھیں تو ایسے لوگوں کا پتا ہوگا جن کے پاس ابھی بھی دولت ہے۔ ہم لوگ تو......۔''

''ٹھیک ہے! ہم بھی یہ جانتے ہیں تمھارے پاس بہت زیادہ دولت نہیں، لیکن ہم کیا کریں ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اس لیے تم یہ کھڑکی کھولو اور ہمیں صرف ایک سو ڈالر دے دو۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ دوسری صورت میں ہم اندر آئیں گے اور تمھیں مزہ چکھائیں گے۔ ایسے۔''

ایک آٹومیٹک گن سے ہونے والے فائر کی زبردست آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ ماریا اور بچے ایک بار پھر زور زور سے رونے لگے۔

''اوہ مسّی ...... روؤ مت...... اس کی ضرورت نہیں ہے...... ہم نے کہا نا کہ ہم شریف چور ہیں...... ہم صرف ایک چھوٹی سی رقم لیں گے اور خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں گے...... کوئی بے حرمتی نہیں کی جائے گی...... ہمارا وعدہ ہے۔'' سرغنہ کی آواز آئی۔

''بالکل صحیح۔'' بقیہ چوروں کی آوازیں سنائی دیں۔

''دوستو!'' جوناتھن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''تم نے جو بھی کہا میں نے سنا۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر میرے پاس ایک سو پونڈ ہوتے تو میں......''

''دیکھو میرے دوست! تم ہم سے کھیل کھیلنے کی کوشش مت کرو...... اگر ہم غلطی سے تمھارے گھر کے اندر گھس آئے تو پھر اس کے بعد کا کھیل بہت برا ہوگا۔''

''خدا کی قسم جس نے مجھے پیدا کیا۔ تم گھر کے اندر آؤ اور اگر تمھیں ایک سو پونڈ مل جائیں تو میں تم سے کہتا ہوں کہ تم مجھے اور میری بیوی بچوں کو گولی مار دینا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ آج میرے پاس اگر کوئی رقم ہے تو وہ ہے صرف بیس پونڈ جو آج ہی ایگ ریشر کے طور پر مجھے ملے ہیں......'' جوناتھن گڑگڑایا۔

''ٹھیک ہے...... چلو...... کھڑکی کھولو اور وہ بیس پونڈ میرے حوالے کرو...... ہم اسی میں کام چلا لیں گے۔''

اچانک باہر سے بہت ساری بھنبھناتی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''ارے جھوٹ بولتا ہے۔''

''یہ آدمی جھوٹ بولتا ہے۔''

''ہمیں اندر جا کر اچھی طرح تلاشی لینی چاہیے۔''

''اس کے پاس زیادہ رقم ہے۔''

''خاموش رہو۔'' سرغنہ کی غراتی ہوئی آواز فائر کے دھماکے کی طرح فضا میں گونج اٹھی اور ساری بھنبھناتی آوازیں یک لخت خاموش ہو گئیں۔

''کیا تم موجود ہو؟ جلد رقم میرے حوالے کرو۔''

''میں آ رہا ہوں۔'' جوناتھن جلدی سے بولا۔

اندھیرے میں وہ لکڑی کے ننھے سے صندوق کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، جسے اس نے اپنے پاس ہی چٹائی پر رکھا ہوا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کے پڑوسی اور کئی دوسرے لوگ اظہار افسوس کے لیے جمع ہوئے۔ جوناتھن اپنا پانچ گیلن کا ڈرم سائکل کے کیریر سے باندھ رہا تھا اور اس کی بیوی آگ پر چڑھی مٹی کی ہانڈی میں کھولتے ہوئے تیل میں اکارا بالوں کو الٹ پلٹ رہی تھی اور پسینے میں شرابور بھی۔ ایک طرف اس کا بڑا بیٹا بیئر کی پرانی بوتلوں سے کل کی بچی تاڑی کو دھو رہا تھا۔

''میرے خیال سے یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔'' اس نے ہمدردی جتانے والوں سے کہا، اس کی نگاہیں اس رسی پر جمی تھیں جسے وہ باندھ رہا تھا ''ایگ ریشر کیا چیز ہے؟ کیا میں گزشتہ ہفتے تک اس پر منحصر تھا؟ کیا وہ ان چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے جو میں اس جنگ میں کھو چکا ہوں؟ میں کہتا ہوں، اس ایگ ریشر کو چولہے میں جھونکو، اسے بھی وہیں جانے دو جہاں ہمارا سب کچھ گیا ہے۔ خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔''

❑❑❑

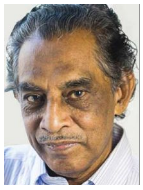

جے. ایم. سالی

سنگاپور براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، سنگاپور

عکس

میاں بیوی دونوں خوبصورت ہوں تو بھلا ان کا بچہ کیسے کالا ہوسکتا ہے؟ گاؤں کی ساری عورتوں کو اس میں شبہ تھا۔ صفیہ تو چھلی ہوئی مرغی کے گوشت کی طرح لال ہے اور شریف جیسے الوول مچھلی لیکن بچہ پیدا کیا ورال مچھلی جیسا۔ مرضی اللہ کی۔ قادر بخش مچھیرے کی بیوی خدیجہ جاتے جاتے اوپر کا جملہ کہہ گئی ہے۔

روز گاؤں سے کم سے کم چار شخص بچے کو دیکھنے آتے اور متعجب ہوکر اس کے رنگ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ جاتے۔ صفیہ بت بنی رہتی۔ یہ اس کا پہلا بچہ تھا اور زچگی کے بعد وہ ابھی ابھی مائیکے سے لوٹی تھی۔ ساس نے بھی بہو کا ویسا استقبال نہیں کیا تھا جیسا کہ عموماً ان حالات میں کیا جاتا ہے۔ اس نے بچے کو دیکھا اور منھ بسور لیا۔ بہو کو سناتے ہوئے بولی:

'یا اللہ! اب مسور کی ٹہنی سے بھی باکلا جھڑنے لگا۔ ایسا تو کبھی نہ سنا تھا۔ بچہ دیا بھی تو ایک دم کالا سیاہ۔ یا رحمۃ اللعالمین! کیسے مان لوں کہ یہ اسے خاندان کا تخم ہے۔'

ساس کی الزام تراشی اور طعنوں سے صفیہ رنجیدہ تو ہوئی مگر اس سے کچھ کہتے نہ بنا۔ بچے کا رنگ کالا تھا۔ اس کی شکل نہ تو باپ سے میل کھاتی تھی نہ ماں سے جو بھی دیکھتا، یہی کہتا۔

باپ باہر تھا۔ اس نے اب تک بچے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ آج یا کل میں آنے والا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر تھا اور مذہبی مجالس میں تقریریں کرنا اس کا پیشہ تھا۔ اس سلسلہ میں وہ ہفتوں اور مہینوں باہر رہتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسے گھر سے نکلے ہوئے قریب دو مہینے گزر چکے تھے۔ بچے کی پیدائش کی خبر اسے خط کے ذریعہ دی جا چکی تھی جس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے جواب بھی دیا تھا۔ صفیہ کو اس نے الگ سے ایک خط لکھا تھا۔ 'ابھی ایک دم تو میں نہیں آپاؤں گا کیونکہ ابھی بہت سی خاص خاص تقریریں باقی ہیں۔'

اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ بچے کی نام رکھائی کی تقریب اس کے گھر پہنچنے پر ہی کرائی جائے۔

> تمل زبان کے معروف ادیب، ڈراما نگار اور صحافی جمال الدین محمد سالی کی ۵۰ سے زیادہ کتابیں ۸۰ ڈرامے اور ۴۰۰ سے زیادہ افسانے منظر عام پر آچکے ہیں۔ سنگاپور میں قائم تمل لینگویج براڈ شیٹ 'تمل مُراسو' میں تقریباً سات سال بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرنے کے بعد تمل کی مشہور ہفتہ وار میگزین میں بھی خدمات انجام دیں۔ سالی سنگاپور براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (ٹیلی ویژن کارپوریشن آف سنگاپور) میں سینئر براڈ کاسٹ جرنلسٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'عکس' جس کا اردو ترجمہ **ڈاکٹر بانو سرتاج** نے کیا ہے۔

وہ کسی بھی دن پہنچ سکتا ہے بچے کو دیکھے گا تو کہے گا۔

'صفیہ! اس میں نہ تو میری شباہت ہے نہ تمہاری۔ پتہ نہیں کس کا عکس پڑا ہے؟'

اگر دوسرے لوگ اس سلسلہ میں اس پر انگلی اٹھاتے تو وہ چپ رہ سکتی ہے لیکن اس نے بھی اگر ایسا ہی سمجھ لیا؟ شریف تو اس پر سیکڑوں الزام لگا سکتا ہے۔

صفیہ اپنے شوہر کی فطرت اور طعنے مارنے کے انداز کو جانتی ہے۔ وہ تو صاف صاف الفاظ میں اس سے پوچھے گا اور جواب کا بھی منتظر رہے گا۔ بعض اوقات تو وہ مذاق میں اسے کہہ دیا کرتی تھی۔

'تم تو اپنی بیوی سے بھی ایسے بات کرتے ہو جیسے کسی محفل میں تقریر کر رہے ہو۔'

'تقریر کے طفیل ہی تو میں نے تمہیں پایا ہے صفیہ! کیا تم عورتوں کے درمیان حیرت سے منھ کھول کر بیٹھی میری تقریر نہیں سنا کرتی تھیں؟ ان تمام عورتوں میں سے میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟'

واقعتاً انہوں نے ایک دوسرے کو پہلے پہل ایسے ہی دیکھا تھا۔ لگ بھگ ایک مہینے سے وہ صفیہ کے گاؤں میں مذہبی مسئلوں پر تقریریں کر رہا تھا۔ ایک روز اسے صفیہ کے گھر دوپہر کے کھانے پر بلایا گیا۔ وہیں ان کی نظریں ملیں اور پھر وہ ایک دوسرے کے شریک حیات بن گئے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔

پہلا بچہ اور وہ بھی کالا۔

اس کی ساس کو شک نے گھیر لیا ہے۔ صفیہ پریشان تھی۔ کیسے مان لیا جائے کہ اس کا شوہر بھی اس پر شک نہ کرے گا؟

صفیہ گھنٹوں بچے کو تکتی رہتی۔

شریف آ پہنچا۔ بڑی بیتابی سے وہ بچے کے پاس پہنچا اور پیار سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔

صفیہ کا اندیشہ صحیح نکلا۔ وہی ہوا جو اس نے سوچا تھا لیکن شریف نے اس سے کچھ پوچھا نہ کہا۔ شریف کا اس طرح نظر انداز کیا جانا اسے اندر تک چوٹ پہنچا گیا۔

''تم تو گاؤں گاؤں گھومتے رہے اور یہاں تمہارے لئے یہ سوغات آ گئی۔' صفیہ کی ساس نے بیٹے کو اکسایا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کئی دنوں کے بعد گھر آیا بیٹا سکون سے نہ رہ پائے۔ بچے کو دیکھنے آئے لوگوں نے جو جو کہا من وعن شریف کو بتا دیا گیا۔ شریف کے دل میں بھی وہ شبہات جڑ پکڑ گئے جو اس کی ماں کے دل میں تھے۔

'تم جب جب باہر گئے، تمہاری بیوی اکثر ہی مائیکے کی راہ لیتی تھی۔ میں پوچھتی ہوں وہ بار بار وہاں کیوں جایا کرتی تھیں؟ یہاں بھی اس سے ملنے جب تب لوگ آیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ اس کے رشتہ دار ہیں۔ پتہ ہے تمہیں اس کے خاندان میں بیس سے تیس برس والے اس کے کتنے رشتہ دار ہیں؟ بہت سے ہیں۔ کیا پتہ کون سا سانپ کس بل میں تھا؟'

اس کی ماں چنگاری کو ہوا دے رہی تھی اور صفیہ اپنے آپ میں سکڑتی جا رہی تھی۔ شریف اس سے پوچھتا تو یہی کہ اس بارے میں تمہارا کیا کہنا ہے؟ لیکن اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کیا اس کے دل میں اندر ہی اندر کوئی جوالامکھی پک رہا تھا؟ کوئی طوفان اٹھ رہا تھا۔

صفیہ چور سی بن گئی تھی۔ وہ کہتی بھی تو کیا؟ یا اللہ! اب تیرا ہی سہارا ہے۔ جانے انجانے میں جو گناہ مجھ سے سرزد ہوئے انہیں تو جانتا ہے۔ مجھے بخش دے میرے مالک! مجھے سچی راہ دکھا۔ نیک راہ پر چلنے کی توفیق دے۔ وہ دعا مانگتی رہتی۔

صفیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا جاتیں۔ دل بھر آتا۔

شریف گھنٹوں سر لٹکائے بیٹھا رہتا۔ شک کا سایہ اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔ جو شخص گھنٹوں تقریر کر سکتا تھا اس کی زبان جیسے جم گئی تھی اور اس کا سبب تھا بچے کا رنگ۔

صفیہ کی خاموشی۔

ماں کا اکسانا! لیکن اسے اکسانا بھی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس میں صداقت نہیں ہے؟ اس کے دورے پر نکلتے ہی صفیہ اکثر مائیکے چلی جایا کرتی تھی اور وہاں مائیکے میں بہت سے نوجوان رشتہ دار ہیں اس کے۔ کچھ ہونا ناممکن تو نہیں ہے؟

جن دنوں صفیہ سے اس کی شادی ہوئی تھی اس نے پوچھا تھا۔ 'صفیہ! تم مجھ سے شادی کے لئے راضی کیسے ہو گئیں؟ جب کہ تمہارے خاندان میں ہی کئی لائق لڑکے موجود تھے؟'

'آپ جگہ جگہ گھومتے ہیں؟ کیا آپ نے کوئی دوسری لڑکی کہیں پسند کی تھی؟'

'اچھا، میری بساط مجھ پر ہی الٹ رہی ہو۔'

'سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے نہیں تو ہماری شادی کیسے ہوتی؟'

'سچ کہو صفیہ! تمہاری شادی اپنے رشتہ داروں میں نہ ہونے کا تمہیں ملال تو نہیں؟'

'ملال کیوں ہونے لگا اور میرے رشتہ داروں کو بھی رنج کیوں ہوگا؟ ان سب کو تو مجھ سے بیحد انسیت ہے۔ بچپن سے ہم سب ساتھ رہے اور بغیر کسی روک ٹوک کے کھیلے بڑے ہوئے ہیں۔'

'ان میں سے کوئی مجھ سا گورا رنگ کہاں تھا؟ وہ سب کالے تھے۔'

'تو؟'

'تو کیا؟ تمہارا رنگ صاف تھا۔ ان ساری عورتوں میں تم دور ہی سے چمکا کرتی تھیں۔'

'اچھا جی! تو یہ بات ہے۔ جہاں جاتے ہیں، وہاں آپ کی نظر عورتوں پر رہتی ہے۔ بتائے دیتی ہوں اگر یہ عادت نہ چھوڑی تو ایک دن ضرور پچھتانا پڑے گا۔'

'مجھے یا تمہیں؟'

'دونوں کو۔'

بڑے عجیب ڈھنگ سے بات بڑھ گئی تھی۔ کسے پتہ تھا ان کی بات بڑھتے بڑھتے مسئلہ بن جائے گی لیکن وہ مسئلہ بن گئی۔

موج در موج اٹھتی گئی اور شریف کے دل کا سمندر شک کے جھاگ سے اٹا چلا گیا۔

'اگر میں قسم کھا کر بھی کہوں گا تو کون یقین کرے گا کہ میری اولاد ہے۔ اف! کتنا فرق ہے؟'

پڑوسیوں میں بچہ موضوع بحث بنا رہتا کہ شریف کے گھر میں اس کی بیوی کو بچہ ہوا ہے۔ بالکل کالا۔

'صبح سے شام تک یوں منھ لٹکائے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ تم کیوں رنجیدہ ہوتے ہو بیٹے؟' ماں بیٹے کو کریدتی۔

'میں باہر جا رہا ہوں اماں۔ چٹھی پر چٹھی آ رہی ہے۔ اگر میں کچھ جگہوں پر ہو آؤں گا تو ممکن ہے میرا دل بہل جائے۔' شریف کا گلا بھر آیا۔ ماں نے جلتی پر تیل ڈالا۔

'لوگ مجھ سے نام رکھائی کی تقریب کے بابت دریافت کریں گے۔ کون کرائے گا تقریب؟' شریف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

'تمہارے جانے کے بعد عقیقہ یہاں کیسے ہو پائے گا؟ نام رکھائی کون کرے گا؟ جو کچھ بھی ہونا ہے۔ قاعدے سے ہو جائے، تب جانا۔'

شریف سمجھ نہیں سکا کہ ماں نے کیا کہا ہے اور کس مقصد سے کہا ہے۔ صفیہ نے بھی سنا، نشانہ ٹھیک دل پر لگا، اس کا تن بدن جل اٹھا۔ 'یا اللہ! تو ہی بخشنے والا ہے۔ میری مشکل آسان کر خدایا!'

وہ سوکھتی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر اسی طرح وہ غم کھاتی رہی تو چند دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی۔ شریف سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ صفیہ جانتی تھی کہ گزشتہ دنوں میں اسے الگ الگ

مقامات سے کئی خطوط ملے ہیں۔ اسے اس کے باہر جانے کا کوئی رنج نہیں تھا۔ ملال تھا اس بات کا کہ ہمیشہ کی طرح شریف نے مسکرا کر اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ شخص جو بچے کی نام رکھائی کی تقریب کے بارے میں تفصیل پوچھتا رہا تھا وہ اس معاملے میں اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہے گا؟ مروّتاً بھی نہیں۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

پہلے وہ پر جوش ہو کر بتا دیا کرتا تھا کہ وہ کس مقام پر اپنی تقریر میں کیا کہنے والا ہے۔ صفیہ سے مشورہ بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے خیالات کو بھی اہمیت دیتا تھا۔ صفیہ سوچتی تھی کہ ممکن ہے اس کی تجاویز اور خیالات سامع خواتین کے لئے دلچسپ ثابت ہوتے ہوں لیکن اب۔ اب تو سب کچھ غلط سا ہو گیا ہے۔ اب وہ صفیہ کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔ وہ بھی سر اونچا نہیں کرتی جیسے گناہ گار ہو۔

آخر صفیہ تنگ آ گئی۔ اس خاموشی کو ختم کر دینے کی غرض سے اپنا دل پکا کر کے وہ شوہر کے نزدیک آ گئی۔

’آپ پھر سفر پر چل گئے۔‘ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

شریف نے اثبات میں سر ہلا کر کہا، ’ہاں‘

’مجھ سے کچھ کہنا سننا نہیں ہے؟‘

’کس بابت؟‘

پہلے تو جب بھی آپ آیا جایا کرتے تھے تو مجھ سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے؟

’تم کچھ بتانا چاہتی ہو تو بتا دو۔‘

’میں نے حضورؐ کی ایک حدیث پڑھی ہے۔ میرا خیال ہے یہ حدیث آپ کی تقریر میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔‘

شریف نے اس کی طرف دیکھا۔ ان موقعوں پر ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ صفیہ کہتی تھی اور شریف سامع بن جاتا تھا۔ صفیہ نے کہنا شروع کیا۔ ایک شخص حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، میری بیوی نے ایک کالا بچہ پیدا کیا ہے۔ اسے شک ہو گیا کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

شریف کے کان کھڑے ہو گئے۔

حضورؐ نے دریافت کیا کہ تمہارے یہاں کوئی اونٹ ہے؟

وہ شخص بولا، ہاں! ایک ہے۔

حضورؐ نے اونٹ کے رنگ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے بتایا ’سرخی مائل بھورا ہے۔‘

صفیہ نے توقف کیا پھر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

حضورؐ نے دریافت کیا کہ تمہارے اونٹ کی لال بھوری کھال پر کہیں کوئی سفید داغ بھی ہے؟ تو اس نے حامی بھر لی۔ حضورؐ نے پوچھا۔ ’تمہارے سرخی مائل بھورے اونٹ کی کھال پر وہ سفید داغ کہاں سے آیا؟ کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا؟‘ وہ شخص کچھ نہ بولا اور خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔

صفیہ چند لمحوں کے لئے رکی اور پھر بولی۔ اس شخص نے سوچ کر جواب دیا۔ ’ہو سکتا ہے اس کی کسی نس میں کوئی خرابی رہ جانے سے کھال پر نشان آ گیا ہو۔ رنگ میں فرق آنے کا کوئی دوسرا سبب بھی ہو سکتا ہے۔‘

حضور نے فرمایا، شاید تمہارے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہو۔ تمہارے بچے کی کسی نس میں کہیں کوئی نقص رہ جانے سے بھی تو رنگ کالا ہو سکتا ہے۔‘ حضورؐ کی دلیل سے مطمئن ہو کر وہ شخص چلا گیا۔

صفیہ نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ شریف پھٹ پڑا ’نس میں خرابی رہ جانے سے ہمارے بچے کا رنگ کالا نہیں ہوا ہے صفیہ، بات کچھ اور ہے۔ میں جب تقریر کرتا ہوں تو میری نظریں بار بار ادھر ہی جاتی ہیں جہاں جوان اور خوبصورت عورتیں بیٹھی ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ میری اولاد سیاہ فام ہو جائے۔‘

وہ صفیہ کو سب کچھ تفصیل سے بتانا چاہتا تھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم ہو گیا ہو۔ اف! صفیہ پر اتنا شک! توبہ توبہ! کیا کوئی عورت جس کے دامن پر رتی بھر بھی گندگی ہو وہ صاف گوئی سے اتنا سب کچھ کہہ سکتی ہے؟

شریف نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور خوش دلی سے بولا:

’ہمارے بچے کو تو لاؤ صفیہ۔۔۔‘

❑❑❑

’نیا دور‘ کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے ’نیا دور‘ اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

فضل حسنین
A-7، پترکار کالونی، اشوک نگر، الہ آباد
موبائل: 7499178776

واہ رے مکان

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انسان کبھی اپنے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں رہتا اور اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات موجیں مارتی رہتی ہیں۔ ایک خواہش پوری ہوئی نہیں کہ جھٹ اس خالی جگہ پر کوئی دوسری تمنا براجمان ہو جاتی ہے۔ مرزا غالبؔ جیسے دانشور بھی اس مسئلے سے اتنے ہی پریشان رہے اور کہہ اٹھے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو صاحب یہ تمہید باندھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ہم بھی ہیں بہرحال انسان ٹائپ کی ہی کوئی چیز۔ اس لئے ہماری خواہشات کا سلسلہ بھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ایک زمانے سے کرائے کے مکان میں رہتے رہتے اور مالک مکان کی مہربانیوں کے شکار ہوتے ہوتے بس یہی دل چاہتا کہ اگر جنگل میں بھی تھوڑی سی جگہ مل جاتی تو خود اس پر چھپر ہی ڈال کر وہیں منتقل ہو جاتے اور کرائے دار کے بجائے ایک مالک مکان کی حیثیت سے سینہ تان کر چلنے لگتے۔

اتفاق سے خواہشیں ہمیں بالکل سوٹ نہیں کرتیں لیکن ہم بڑی سے بڑی آرزو کو دل میں جگہ دے دینے میں ذرا بھی تاخیر اس خیال سے نہیں کرتے کہ جب کوئی خواہش پوری ہی نہیں ہوتی ہے تو پھر کیوں نہ بڑھ چڑھ کر ہوائی قلعے بنائے جائیں۔

پر صاحب! اس بار ہم سے چوک ہوگئی اور اپنا مکان ہو جانے والی خواہش ٹھیک نشانے پر بیٹھ گئی اور جب صحافیوں کے لئے نئی کالونی کی پلاٹنگ ہوئی تو ایک پلاٹ ہمارے ہاتھ بھی لگ گیا جب کہ درخواست ہم نے یہ سوچ کر دے دی تھی کہ بھلا لاٹری میں ہمارا نام کہاں نکلنے جا رہا ہے۔

خیر صاحب! جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اب مکان مالک بننے کے لئے اس پلاٹ پر چھت ڈالنی تو ضروری ہی تھی۔ چنانچہ اپنی زندگی بھر کی کمائی جو ہماری ہی طرح مختصر تھی، سے مکان میں ہاتھ لگا دیا اور یہیں سے ہماری بربادی کی داستان شروع ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اگر کسی کو سکھ چین سے رہتے آپ سے دیکھا نہ جا رہا ہو تو کسی طرح اسے بس مکان بنوانے کے چکر میں پھنسا دیجئے اور پھر اطمینان سے اس کی قلابازیوں سے لطف لیتے رہئے۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ مکان بننے تک ہم پر کیا کیا گزری، اس کا پورا قصہ تو ایک بار میں بیان کر پانا ممکن نہیں۔ آپ میں سے جو اس تجربے سے گزر چکے ہیں، وہ ہمارا درد پوری طرح سمجھ سکتے ہیں لیکن جو خوش نصیب ابھی تک اس سے محفوظ رہ گئے ہیں، اگر خدانخواستہ انہیں بھی کبھی ’مکان والا‘ بننے کا اتفاق ہوا تو وہ ہمارے درد کو بہتر طور پر محسوس کر سکیں گے۔

ہاں، تو ہم ابھی تک اپنے جس مکان کا بکھان کرتے آئے ہیں، اسے کہنا تو ہم بھی مکان ہی چاہتے ہیں لیکن یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دینے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی اگر ہمارا مکان تلاش کرنے ہی لگے تو اسے شاید ہی کامیابی مل سکے کیونکہ ہمارا مکان محض دو کمروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بھی ایک کمرہ بطور باورچی خانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے Mechanically تو یہ دو کمروں والا مکان ہی کہا جائے گا لیکن ہم اس میں Mechanically تو رہتے نہیں، ہم تو اس میں Practically رہتے ہیں۔ اس لئے اسے دو کمروں کا مکان کہنا زیادتی ہوگی۔ اسی لئے ہم نئے واقف کاروں سے یہی کہتے ہیں کہ کسی دن ہمارے کمرے پر بھی تشریف لائیے! پھر جب لوگ واقعی آنے ہی لگتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پلاٹ کا بیشتر حصہ تو ہنوز خالی ہی پڑا ہے۔ ایک آدھ ’منھ پھٹ‘ قسم کے نو وارد نے ہم سے سوال بھی کر دیا: مکان بنوانا کب شروع کر رہے ہیں؟ چنانچہ اب لوگوں سے ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ کسی دن ہمارے پلاٹ پر بھی تشریف لائیے!

ویسے اتنے مکان سے ہمارا کام بہت اچھی طرح سے چل رہا ہے لیکن پریشانی خواہ مخواہ کے ہمدردوں سے ہو رہی ہے کیونکہ شاید ہی کوئی آنے والا ہمیں دو چار مشورے دے کر ہی پلٹتا ہو جن میں سب سے عام مشورہ یہی ہوتا ہے کہ ارے صاحب! اتنی زمین پڑی ہے۔ مانا کہ آپ کو ایک کوٹھری میں پڑے رہنا ہی سوٹ کرتا ہے، لیکن دو چار کمرے بنوا

کرکرائے پر اٹھا دینے میں کیا حرج ہے۔آمدنی کی آمدنی بڑھے گی اور مکان مالک بن کر کرائے داروں کے سامنے سینہ تان کر چلنے کا سکھ الگ ملے گا۔ ان مشیروں کی اکثریت ایسے ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جن کا پورا زور اس پر تھا کہ ہم خالی پڑی زمین پر کاشتکاری کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ایک صاحب نے قریب قریب گڑگڑاتے ہوئے فرمایا، بھائی جان! لوگ تو ترستے ہیں کہ ان کے پاس تھوڑی بھی زمین ہوتی تو اس میں کھیتی باڑی یا کم ازکم باغ بغیچہ ہی بنا لیتے۔آپ نے دیکھا نہیں،لوگ شیشی بوتل میں ہی پھلواری بنا لیتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ اتنا بڑا کھیت پڑا ہے اور آپ کو اس میں ساگ سبزی لگوانے تک کا خیال نہ آیا۔

جب ہر آنے والا اسی 'زریں مشورے' پر اپنی مہر لگانے لگا تو مجبور ہو کر ان مشیروں کا منہ بند کرنے کی غرض سے ایک روز بازار میں جتنے بھی قسم کے بیج مل سکے، لاکر ہم نے پورے میدان میں یعنی کھیت میں چھینٹ دئے۔اس کے بعد جو بھی آتا، اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ہم پوزیشن لیتے ہوئے یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیتے کہ 'فصل بوئی جا چکی ہے'۔

جب پودے کچھ بڑے ہونے لگے تو آنے والے ہمارے بجائے اب 'کھیت' کے بارے میں ہی پوچھ تاچھ کرنے لگے۔ہم نے انہیں صاف بتا دیا کہ بھیا ابھی تو ہم خود ہی نہیں جانتے کہ کون سا پیڑ کس چیز کا ہے؟ جب ان میں پھل آئیں گے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون سا پیڑ کیا سپلائی کرے گا۔تب تک صبر کرنے میں آپ بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

لیکن صاحب! پھر وہی بات ہوئی کہ ابھی تک جو پیڑ اپنی شناخت بتا پانے کے قابل ہوئے، ان سب میں ہمیں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی اور جو چیزیں ہمیں پسند ہیں، ان کے پھلنے کا انتظار ہمیں بھاری پڑ رہا تھا کیونکہ وہ پودے ایک ایک کر کے سوکھتے گئے۔ہم نے بھی غصے میں باقی پودوں کی واٹر سپلائی بند کر دی۔ اب صرف ایک ہی پیڑ ایسا رہ گیا تھا جو 'دانہ پانی' پائے بغیر بھی سینہ تانتا جا رہا تھا۔ہمیں اس کی وفاداری پر ترس آ ہی گیا اور ہم نے اس میں پانی ہی نہیں، کھاد بھی ڈالنی شروع کر دی۔اب اس پیڑ کی حیثیت اکلوتی اولاد جیسی ہو چلی تھی۔چنانچہ روز صبح آنکھ کھلنے پر سب سے پہلے ہم سہلاتے ہوئے اسے 'دانہ پانی' دینے کے بعد ہی کوئی اور کام شروع کرتے۔

اسی درمیان ایک روز ہمارے ایک دوست آ گئے۔ جب انہوں نے بھی کھیت کا معائنہ کرتے ہوئے سوال کر دیا، اتنی زمین خالی کیوں چھوڑ رکھی ہے؟ ہم نے بجھے دل سے بتایا کہ پودے تو بہت تھے لیکن وفادار صرف یہی بے چارہ نکلا اور اب ہماری ساری امیدیں اسی غریب سے لگی ہوئی ہیں۔اب اس میں پھل لگیں تو پتہ چلے کہ یہ کون سی سبزی سپلائی کرے گا۔ اس پر ہمارے دوست نے معنی خیز تبسم کے ساتھ فرمایا: بھائی صاحب! آپ ریڑ کی سبزی کھاتے ہیں؟ یہ تو ریڑ کا پیڑ ہے۔

یہ سن کر ہم پر کیا گزری ہوگی، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ:

'جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے 'دغا' دینے لگے'

❑❑❑

'نیا دور' جون ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

نیا دور کی تاریخ پر **احمد ابراہیم علوی** اور **سلمان علی خان** کا مضمون،

ساتھ میں **ملک زادہ منظور احمد** کی ادار یہ نگاری پر **فضل الرحمن اصلاحی** کا مضمون

پرویز شہریار، جابر حسین، نیاز جیراجپوری، شہناز فاطمہ، جاوید اکرم

اور **خادم رسول عینی** وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں

اقبال مجید، عمران قریشی، محمد حنیف خاں، احتشام الحق، ذاکر فیضی اور **سید ظفر ہاشمی** وغیرہ کے افسانے

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات بدستور موجود رہیں گی

شاعر و ادیب ڈاکٹر امام اعظم نے مظہر امام کی شخصیت پر لکھے گئے اہم ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین کو یک جا کر کے پوری ادبی دنیا پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ ایک ہی کتاب میں مظہر امام کی پوری شخصیت کا عکس و نقش اختصار کے ساتھ سمٹ آیا ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس مونوگراف نما مرتبہ کتاب کی اشاعت کا ذمہ لے کر نہ صرف اہلِ بہار بلکہ مرحوم کے محبین و منتسبین اور پوری اردو برادری کو گراں بار کیا ہے۔

کتاب مختصر ضرور ہے اور منتشر و متفرق مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ ہے، مگر ان نمائندہ تحریروں سے مظہر امام کی زندگی کے شب و روز سے عرفان و آگہی حاصل کرنے اور ان کے فکر و فن کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ کتاب کا آغاز سکریٹری اتر پردیش اردو اکامی کے تحریر کردہ ''اپنی بات'' سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد عرض مرتب ہے۔ پھر بنیادی موضوع مظہر امام پر مضامین و مقالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلا طویل و مبسوط مضمون خود فاضل مرتب کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے دریا بکوزہ کے مصداق مظہر امام کی شخصیت کا وہ ہیولی تیار کیا ہے، جس میں وہ اپنی تمام ادبی و شعری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ تقریباً ۵۰ صفحات پر مبنی یہ مضمون نہ صرف شاعر مرحوم کی پیدائش، حسب و نسب، تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت، تصنیفی تالیفی اور تحریکی سرگرمیوں، پیشہ وارانہ مصروفیت سے لے کر وفات تک کے نجی اور خاندانی حالات سے بحث کرتا ہے، بلکہ ان تمام ادبی و شعری جہات و ابعاد کا انکشاف بھی کرتا ہے، جو مرحوم کی شخصیت میں مجتمع تھیں۔ اس کے بعد ان کے فن اور شخصیت پر مندرجہ ذیل مضامین نقل کیے گئے ہیں۔ ''مظہر امام: قلمی خاکہ'' (پروفیسر ظفر احمد نظامی)، ''مظہر امام: الفاظ کے رمز شناس'' (آل احمد سرور)، ''اکثر یاد آتے ہیں'' خاکوں کی صورت میں (پروفیسر ابوالکلام قاسمی)، ''مظہر امام اور علاقائیت پسندی کے رجحان پر احتجاج'' (پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی)، ''مظہر امام: کج کلاہی میں کوئی سر نہیں تیرے جیسا'' (مشتاق احمد نوری)، ''مظہر امام کا تنقید نامہ'' (ڈاکٹر جمال اویسی)، ''مظہر امام: قاری اساس نقاد'' (ڈاکٹر مجیر احمد آزاد)۔ بعدہٗ مظہر امام کی تخلیقات پر مشاہیر علم و ادب کی جو معتبر تنقیدی تاثراتی آرا ہیں، انھیں باختصار درج کیا گیا ہے۔ ان مشاہیر میں احتشام حسین، اختر اورینوی، ارشد کاکوی، انور سدید، آنند نرائن ملا، جمیل مظہری، خلیل الرحمن اعظمی، رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر، شمس الرحمن فاروقی، عرش ملسیانی، فراق گورکھ پوری، قمر رئیس، کرشن چندر، گوپی چند نارنگ، نیاز فتح پوری، وارث علوی اور وزیر آغا اہم اور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ پھر مستقل عنوان کے تحت ان چند مکاتیب و خطوط کا سلسلہ ہے، جو مظہر امام کے معاصرین و احباب اور اس وقت کے اہم ناقدین نے انھیں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں نجی زندگی اور ذاتی معاملات ہی نہیں، بہت سے ادبی اور شعری نکات بھی زیر بحث آئے ہیں اور شاید یہی امور ان خطوط کی شمولیت کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ پھر دو انٹرویو دیے گئے ہیں، ایک مشہور افسانہ نگار انتظار حسین کا بات چیت نما مختصر مکالمہ ہے، تو دوسرے انٹرویو نگار خود مرتب ہیں۔ یہ مصاحبہ خاصا طویل بھی ہے اور ان کی نجی و ادبی زندگی، پسند و ناپسند، ادبی کمٹمنٹ اور شعری و ادبی ترجیحات کا بھر پور احاطہ کرتا ہے۔ اور سب سے اخیر میں خاتمہ بالخیر کے طور پر، مظہر امام کی نمائندہ تخلیقات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

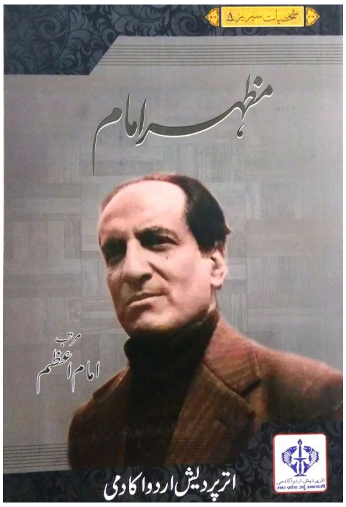

مرتبہ : ڈاکٹر امام اعظم
مبصر : ابرار احمد اجراوی
قیمت : 208 روپے
ناشر : اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
ملنے کا پتہ : اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

مرتب کو تصنیف و تالیف اور ادارت و ایڈیٹنگ کا طویل تجربہ ہے، انھوں نے یہ کتاب بھی بہت محنت و ریاضت سے ترتیب دی ہے اور معاصرین و احباب کے تمام اہم مضامین کے ساتھ ان کی تخلیقات کا انتخاب بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے، تاکہ قاری ان کی شخصیت کے ساتھ ان کی تنقیدی اور تخلیقی حس سے بھی آگاہ و لطف اندوز ہو سکے۔ کتاب غیر مجلد ہے، مگر کاغذ معیاری استعمال کیا گیا ہے اور بہت ہی صاف ستھرے انداز میں عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ پروف خوانی میں دقت نظری اور خورد بینی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہ املا اور جملہ کی ان تمام ظاہری اغلاط سے پاک کتاب ہے، جو آج کل کے کمپیوٹر ایج میں اردو کی کتابوں کا مقدر بن کر رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ مرتب کا یہ تعارفی نوعیت کا کام مظہر امام شناسی کے باب میں مباحث کے نئے در وا کرے گا اور اردو دنیا ازسرِ نو مظہر امام کے فکر و فن کی طرف مراجعت کرے گی کہ ہم اردو والوں کا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور ہم تعصب زدگی کے اس مسموم ماحول میں، اسلاف فراموشی کے مرض میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

□□□

سلمان عبدالصمد کا ناول ''لفظوں کا لہو'' موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے کچھ بدلا ہوا ہے۔ اس ناول کا تجزیہ کرنے والے بیشتر ناقدوں اور تجزیہ نگاروں نے سچ کہا کہ اس میں رشتوں کی ٹوٹتی بکھرتی کڑیوں کو جوڑنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناول اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شائع ہوا ہے، اس لیے ہم اس میں اپنے معاشرے کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ معاشی بدحالی اور میڈیا کی سمت و رفتار کا اندازہ اس سے بخوبی ہوجائے گا۔ حالیہ دنوں میں اُردو میں ویسے تو بہت شاندار ناول لکھے گئے، جن میں اسلوبیاتی آہنگ، موضوعاتی تنوع، جدّت اور ندرت کی کمی نہیں لیکن جو بات ''لفظوں کا لہو'' میں ہے، وہ اپنی جگہ قابل قدر ہے، فکشن کے لیے انفرادیت بھی۔ سلمان عبدالصمد کا پہلا ناول ہے، اس لیے اسلوب فن یا تکنیک کے نقطۂ نظر سے ناول میں کچھ کمزوریاں ہوسکتی ہیں لیکن موضوعاتی پیش کش اور لفظی پیکر تراشی کے اعتبار سے یہ ناول قابلِ تعریف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تین ایڈیشن منظر عام پر آ گئے۔ ناول کے پلاٹ میں گٹھاؤ ہے، اس لیے واقعات ایک دوسرے میں ضم ہیں اور ایک واقعہ دوسرے واقعہ کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ قصے کا تانا بانا دیہاتی اور شہری دونوں پس منظر میں تیار کیا گیا جو کیفیت و کمیت سے بھرپور ہے۔ سماجی رشتوں کی جزئیات کا حقیقت پسندانہ اظہار ہمیں اس ناول میں ملتا ہے۔ کردار نگاری نہایت عمدہ اور جاندار ہے۔ اس کے کرداروں میں محسن، زنیرا، نائیلا، اور نیلا مقبول و معروف کرداروں میں سے ہیں۔ ان کرداروں کا تاثر اتنا گہرا ہے کہ جلد قاری کے ذہنوں سے محو نہیں ہوسکتا۔

''لفظوں کا لہو'' کے مکالمے پس منظر کی مناسبت سے دیہاتی اور شہری لب ولہجہ میں لکھے گئے ہیں اور ناول کی جان قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس ناول میں خواتین کو با اختیار بنانے کے جتنے زاویے سامنے لائیں گے، زبان وبیان کے لحاظ سے بھی وہ قابلِ تعریف ہے۔

مصنف نے اس ناول میں مکالموں زبان، منظر کشی اور جزئیات نگاری سے ناول میں تاثر قائم کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ان مکالموں اور قابل توجہ اقتباسات سے نہ صرف کہانی کو آگے بڑھایا گیا بلکہ ان کرداروں کی تحلیل نفسی بھی کی گئی۔ مصنف کی فنکاری ہے کہ وہ قصہ کی فطری رفتار اور تاثر کو بحال رکھنے کے گرُ جانتے ہیں۔ سلمان عبدالصمد نے اس ناول میں خاص طور سے صحافت کو اپنا موضوع بنائے ہیں۔ اس لئے اس

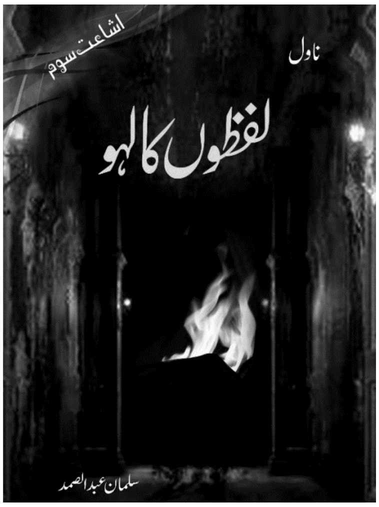

مصنف : سلمان عبدالصمد

مبصر : یاسمین

قیمت : 100 روپے

ناشر : دائمی پرواز ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی لکھنؤ

ملنے کا پتہ : دی کریٹیو پبلی کیشنز، اوکھلا، نئی دہلی

ناول میں میں جا بجا فلسفیانہ انداز اور صحافت کے دیگر مسائل کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناول انسانی رشتوں کی پامالی، صحافت اور سیاست کے گرتے معیار پر روشنی ڈالتا ہے۔ ناول نگار نے نائیلا کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا، پوری کہانی اسی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ زنیرا اور نیلا کے کرداروں کو کافی جرأت بخش دکھایا ہے، وہ بے باک اور حق گوئی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ قاری جیسے جیسے ناول پڑھتا جاتا ہے اس کے واقعات سے اُس پر ان کرداروں کی حقیقت خود بخود آشکار ہونے لگتی ہے مصنف کو الگ سے انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سلمان عبدالصمد نے اس پورے ناول میں خواتین کے جذبات واحساسات کو نہایت ہی عمدہ انداز میں ان ہی کی زبانی پیش کئے ہے اور فلاش بیک کی تکنیک کا استعمال بھی ہمیں اس ناول میں ملتا ہے۔ لہذا سلمان عبدالصمد نے زمانے کی روش کے ہر پہلو کو محسوس کیا اور اپنے ناول میں انسانی زندگی کے تمام تاریک اور روشن پہلوؤں کو سمٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ سماجی ناہمواریوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا، ان تمام مسائل کو اپنے ناول میں جگہ دی۔ مختصر یہ کہ اس دور کے نوجوان ناول نگار سلمان عبدالصمد نے صحافت کے تعلق سے سماج کا ایک اہم مسئلہ سامنے لایا ہے اور یہ مسئلہ قارئین کے ذہن میں ایک سوال چھوڑ دیا ہے، جو کہ یہ ناول نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک کامیاب ناول نگار کی دلیل ہے کہ وہ مسائل کھڑا کرتا ہے اور قارئین کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کرے۔ ایک حساس قاری کی طرح میں نے یہ ناول پڑھا ہے اور برجستہ جو ذہن میں آیا ہے، اسے لکھ دیا ہے۔ میری رائے میں یہ ناول مکمل طور پر تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، مگر فنی معیار قائم کرنا ہم اسکالروں کا نہ ہی ناقدین ادب کا کام ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اور قابلِ تعریف تخلیق ہے جو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ مشہور ناول نگار پیغام آفاقی نے اس نے متعلق جو رائے دی ہے، وہ بھی قابل قدر ہے: ''ناول میں تم نے کرداروں کی ذہنی دنیا کو مرکز بنایا ہے اور باہری دنیا کو سامانِ بیان، یہ اس کی خوبی ہے۔ تمھارا ناول شروع کرتے ہی اتنا سمجھ گیا تھا کہ تم ناول کے حسن اور تقاضوں کو سمجھتے ہو۔ اس ناول میں روح اور اس کی اپنی شخصیت ہے۔'' جدید ناول نگاری میں پیغام آفاقی کا ایک معتبر نام ہے، ظاہر ہے ان کے ان جملوں سے کسی نہ کسی سطح پر ناول ''لفظوں کا لہو'' کی معتبریت ثابت ہوتی ہے۔

□□□

’نیادور‘ ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔

’نیادور‘ ماڈرن بک ڈپو، جن پتھ، حضرت گنج لکھنؤ میں بھی دستیاب ہے۔

۱	محمد نعیم دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیر زمین پارکنگ، امین آباد لکھنؤ Mo.9792361533
۲	مولانا محمد وکیل ندوی علامہ شبلی لائبریری، دار العلوم ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، ڈالی گنج لکھنؤ۔226007
۳	سید محمد سرور عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی مارٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس لکھنؤ
۴	مولانا آصف جائسی نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ، غفرآنمآب چوک لکھنؤ 8736009814
۶	ادارۂ تنظیم المکاتب ریڈ گیٹ بلڈنگ، جگت نارائن روڈ، گولہ گنج لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱	جناب اسد یار خان ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002 موبائل۔96341 05087
۲	جناب طالب حسین ایف۔ڈی۔انٹر کالج، کاٹھ دروازہ، مرادآباد۔ 244001، یوپی۔ موبائل۔098372 25809
۳	ڈاکٹر نہال رضا یوتھ فیڈریشن، عسکری کلینک، محلہ قاضیانہ، پوسٹ ردولی ضلع۔فیض آباد۔ 224120 موبائل۔94151 52710
۴	جناب علی حسین ادریسی ادریسیہ بک سینٹر، نیوز پیپر ایجنٹ، سنگت کلا، غازی پور سٹی۔ 233001 یوپی موبائل۔93693 05266 .
۵	جناب محمد بدر الدین ناولٹی بکس، علامہ اقبال چوک قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔بہار . 846004
۶	جناب زکریہ ایاز ۱، پریم نگر، اورئی، جالون موبائل۔ 9452452788
۷	جناب امتیاز انور بک امپوریم، اردو سبزی باغ پٹنہ۔800004 موبائل۔93048 88739
۸	جناب ضمیر احمد ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔ یوپی 098971 08075 .
۹	جناب روشن صدیقی ناصر لائبریری، ابو بازار اونچوا۔ گورکھپور۔(U.P.) 273001 9451846364
۱۰	ڈاکٹر شکیل احمد قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی مؤناتھ بھنجن۔ 275101 - Mo. 92367 22570
۱۱	جناب ایس۔ایم۔عباس ایڈوکیٹ ۸۸، تارتلہ، جونپور۔ 222001- Mo. 98380 81405
۱۲	جناب بھوانی پرساد گپتا ’ویدھ‘ سابق نامہ نگار ’ترون بھارت‘ اترولہ، بلرامپور (U.P.) 271604
۱۳	میسرس کمالیہ بک ڈپو تاتارپور، بھاگلپور۔ بہار، 812002 Mo. 93341 90757
۱۴	جناب کامل مجید محلہ چاہ میر، مقابل نواب دولہے کی کوٹھی، بدایوں Mo. 94102 93406
۱۵	جناب ساغر وارثی ایمن زئی، جلالپور، شاہجہانپور Mo. 93691 90785
۱۶	میسرس انیس بک ڈپو ۷/۱، محلہ۔ آٹالہ، الہٰ آباد۔ Mo. 93351 68463
۱۷	جناب عباد احمد ایڈوکیٹ جج صاحب کا پھاٹک، مولوی ٹولہ فانی روڈ، بدایوں۔243601 Mo. 94124 08110
۱۸	عارف علی بک سیلر لطیف مارکٹ، خیرآباد ضلع سیتاپور۔(U.P)261131 Mo. 93363 04064
۱۹	جناب ایس۔عزادار حسین نقوی ۶۰/۲۵، حضرت گنج، دریاباد الہٰ آباد (U.P) 211003 Mo. 99198 16295
۲۰	میسرس پوجا پستک بھنڈار سرائے میر، اعظم گڑھ۔276305 Mo. 94510 39177
۲۱	میسرس ہمدم بک اسٹال، مبارک پور اعظم گڑھ، 92362 72662
۲۲	جناب محمد سلیم (جنرلسٹ) پیر بٹاون (پھلواری)، بارہ بنکی Mo. 94157 74724
۲۳	میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس) محلہ۔ سوتھا، شکیل بدایونی روڈ، بدایوں Mo. 93583 57370

۲۴	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۴۔ایچ گلی نمبر۔۶، باٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۔110025 Mo. 098110 29831
۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی۔بی۔ایچ۔مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ -760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنرز جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر-, 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۳۴۷، کٹرہ، الہ آباد، (U.P). 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	جناب بصرالدین سکریٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد،-(U.P).283203 Mo.94562 39242
۲۹	ڈاکٹر وجیہ القمر صدیقی جے۔کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور(U.P). 228001 Mo.94515 58318
۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، ۱۱۲، جی۔ٹی۔روڈ آسن سول، مغربی بنگال- .713301 Mo. 98321 14440
۳۱	میسرس کتاب دار پبلکیشنز ۱۱۰۔۱۰۸، جلال منزل ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی، 7400008
۳۲	خالد لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۳۳	میسرس ایم۔ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج دربھنگہ۔.846004 Mo. 094314 58429

۳۴	جناب ندیم اختر جن سیوا کیندر، پوسٹ۔گنج ڈنڈوارہ ضلع۔کاس گنج، (U.P) 207242
۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہلور، سدھارتھ نگر- 272191 Mo. 94156 69624
۳۶	نور نبی بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی۔کے۔۱۰۱/۴۲، دال منڈی وارانسی۔(U.P) 221001 Mo-94153 55954
۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ۔ 271801 Mo- 94523 11999
۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱/اے، ایچ۔ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا۔مغربی بنگال
۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان،، پوسٹ محمدی۔ ضلع لکھیم پور (U.P).262804 Mobile .94155 62853
۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹/۱۰۵، جبلی کالج روڈ چمن گنج، کانپور(U.P).208001 Mo. 09336720718
۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وثیقہ عربک کالج، راٹھ حویلی، ضلع فیض آباد۔ 224001.(U.P), Mo.95653 83714
۴۲	جناب خبیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب بی۔۱/۱۸، جی، وارانسی۔ 221010 Mo . 95576 3570014
۴۳	جناب ایس۔پرویز میسرس ہورائزن ڈسٹری بیوٹر ۱۴۔بی۔گوراچاند روڈ، کولکاتا۔700014 Mo. 9831311918

۴۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن۔۱، پی۔ڈبلیو۔ڈی، ہردوئی Mo . 9451916715
۴۵	جناب اظہار ندیم عرشیہ پبلیکیشن، اے۔۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳۔سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی۔ Mo 9971775969
۴۶	میسرس۔سکندر نیوز ڈسٹری بیوٹر اینڈ سپلائر، لال چوک، شری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124
۴۷	میسرس کوثر ایجنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان بھنڈار پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ۔ 444001 Mo. 098221 25888
۴۸	ماسٹر محمد سلیم شجاع ول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ۔ضلع کاس گنج Mo. 9557996293
۴۹	جناب سالم رضوی معرفت عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۵، ربیندرا سرائے، کولکاتا Mo. 09433050634
۵۰	جناب محبوب علی محلہ۔چکلی ٹولہ، پوسٹ لہرپور، سیتاپور Mo. 9559347469
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسر سی آر راؤ روڈ حیدرآباد۔500046 Mo. 09391062713
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا، کامٹی، ناگپور Mo. 08956697056
۵۵	مکتبۂ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی۔۶
۵۶	جناب شفیق الرحمن 1/170، گنگا وہار، KDA کالونی، جاج مئو، کانپور موبائل: 9415483499
۵۷	ابرار الحق شاطر گورکھپوری الٰہی باغ نزد چھوٹی مسجد، گورکھپور موبائل: 9695122448

نیا دور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ایجنسیاں ۴۰ رفیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

اس بار بھی میں نے 'نیا دور' کا اپریل ۲۰۱۸ء کا شمارہ انٹرنیٹ پر پڑھا۔ جس طرح سائنس کی برکتوں نے زمینی فاصلے ختم کر دیے ہیں، اسی طرح سائنس کی ایک ایجاد انٹرنیٹ ہے۔ ادبی و ثقافتی سطح پر دوریاں منہدم کر دی ہیں۔ اب گھر بیٹھے ہماری گود میں لیپ ٹاپ کے توسط سے ہر چیز دستیاب ہے۔ دور دراز ملک سے شائع ہونے والے رسالے 'نیا دور' کا پلک جھپکتے ہی یہاں پہنچ جانا اسی ایجاد کا کرشمہ ہے۔ انٹرنیٹ اب سامان تعیش نہیں رہا بلکہ ضرورت بنتا جا رہا ہے اور ہمیں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا جا رہا ہے۔ سائنس کا ذکر آیا تو 'نیا دور' کے تازہ شمارے میں آپ کے اداریے کی جانب ذہن منتقل ہو گیا۔ آپ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اردو میں سائنس پر مبنی ادب کمیاب ہے۔ اس کی اصل وجہ ہم میں سائنسی مزاج کا فقدان ہے جس کی تعمیر و تشکیل کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے اپنے اداریے میں معروف برطانوی سائنسداں اسٹیفن ہاکنگ اور اس کی سائنسی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کا انتقال ڈیڑھ ماہ قبل برطانیہ کے شہر کیمبرج میں ہوا۔ اردو کے دوسرے رسائل میں بھی اس عالمی شہرت یافتہ سائنسداں کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ذکر ہوا ہوگا۔ خوشی کی بات ہے کہ 'نیا دور' کا متذکرہ شمارہ اسٹیفن ہاکنگ کے نام معنون ہے۔ 'نیا دور' کا یہ شمارہ آپ نے خراج عقیدت کے طور پر لاطینی امریکی فکشن نگار گابریئل گارسیا مارکیز کے نام بھی معنون کیا ہے۔ مارکیز کا انتقال چار سال قبل ۱۷/اپریل ۲۰۱۴ء کو میکسیکو سٹی میں ہوا تھا۔ انہیں ۱۹۸۲ء میں ادب کے نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ ان کے ناول One Hundred Years of Solitude کو عالمی سطح پر بہترین ناول تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے پربھات رنجن اور خالد جاوید کے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ناول کے اقتباسات بھی دلچسپی کا باعث ہیں۔ زیر نظر شمارے میں آپ نے اردو کے معروف افسانہ نگاروں مسرور جہاں، شموئیل احمد کے افسانے بھی شامل کئے ہیں جو مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں مرزا جعفر حسین کا مضمون جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا بھی قابل توجہ ہے جس میں لکھنؤ کی دم توڑتی اور مٹتی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی 'نیا دور' کا یہ شمارہ خوب سے خوب تر ہے۔

(پروفیسر) مرزا خلیل احمد بیگ

Brookfield, CT (USA)

نیا دور کے دو شمارے ملے۔ شکریہ۔

آپ کی تجربہ کار نظر نے 'نیا دور' کا رنگ روپ بدل کر رکھ دیا ہے۔ پھر قیمت بھی آپ نے نہیں بڑھائی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب یہ رسالہ 'ہاٹ کیک' ثابت ہو رہا ہے۔ آپ نے کم وقت میں تنوع کا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے 'نیا دور' ہر گھر کا رسالہ ثابت ہوگا۔ میرا بھرپور تعاون ملے گا۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

بھاگل پور (بہار)

مارچ کا شمارہ نثر کی کم یاب صنف 'رپورتاژ' پر مبنی معیاری اور نایاب مضامین کے ساتھ دستیاب ہوا ہے۔ شکریہ! اس کے تحت محترمہ صالحہ صدیقی نے اپنے موقر و احسن 'رپورتاژ' میں دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کا ایک چھوٹا بھائی صحیح اعلان کیا ہے۔ یہ ایک از حد معلوماتی و احسن مقالہ ہے۔ زبان و املا کے چند اغلاط، قوسین کے مابین صحیح الفاظ کے ساتھ، رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مثلاً صفحہ ۵ پر تیسرے کالم میں 'الفاظوں' ('الفاظ' یا 'لفظوں')، صفحہ ۷ پر 'اپنے ناک' (اپنی ناک)، 'میں بہت' (اس میں بہت)، صفحہ ۹ پر 'نبھانے کا (کے) بھی ہنر سے' وغیرہ قابلِ درگزر اغلاط ہیں۔ سید محمد عقیل صاحب نے اپنے 'رپورتاژ' میں 'اے ایم یو' کے مختلف انواع و اقسام کے شعبوں کا بخوبی احاطہ کرتے ہوئے موضوع کے ساتھ کاملاً انصاف کیا ہے۔ اسی طرح محترمہ سفینہ بیگم نے بھی ویمنس کالج سے متعلق اپنے احسن 'رپورتاژ' کے تحت ذاتی نوع بہ نوع حقیقی مشاہدات کی جاندار و شاندار عکاسی کی ہے۔ محترمہ نور فاطمہ نے بھی حیدرآباد یونیورسٹی کی بابت اپنے ایماندر و غیر جانبدار جذبات کو ہویدا کیا ہے۔ بالخصوص وہاں کے طلبہ وغیرہ پر تیلگو زبان کے سیر حاصل اثرات کو بخوبی نشان زد کرنے میں کامرانی حاصل کی ہے۔ چند اغلاط یہاں بھی عجلت میں چلے گئے ہیں۔ مثلاً ص ۲۰ پر 'تک کہ' (تک کے)، ۲۱ پر 'جغرافیاں' (جگرافیائی) اسباب وغیرہ اغلاط درخورِ چشم پوشی ہی ہیں۔ اگرچہ اس شمارے میں تمام تر غزلیات بلند پایہ و موقر ہی ہیں، تاہم اصغر گونڈوی کی تینوں غزلوں میں روایت کے ساتھ ساتھ جدت کا بھی خوبصورت امتزاج دیدنی و گفتنی ہونے کے موجب قابلِ صد ستائش ہی کہا جا سکتا ہے۔ کلی طور پر چکنے کاغذات پر دلکش و دیدہ زیب جاذب نظر طباعت کے ہی باعث یہ جریدہ بھی اردو کے دیگر تمام رسائل میں منجملہ ایک ما بہ الامتیاز اور انفرادی حیثیت کا ہی جریدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک

گرونانک نگر، گلی نمبر 18K، پٹیالہ (پنجاب)

نیا دور کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ رسالے کا لمس ملتے ہی علامہ اقبال کا یہ شعر ذہن میں روشن ہوا" مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ / عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام"۔ رسالے کے مدیر کو اردو اور اس کی ادبی صحافت سے عشق ہو گیا ہے۔ ان کے عشق و جنون کی یہ

کیفیت مجلّے کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔جامعہ نگر دہلی کے ایک بک اسٹال سے رسالہ حاصل کیا۔نیا دور کا پرانا قاری ہوں لیکن درمیان میں رشتہ ذرا کمزور رہا۔جلد ہی رسالہ جاری کروانے کی کوشش رہے گی اور اپنی کوئی تخلیق اشاعت کے لیے ارسال کروں گا۔سہیل وحید اور جملہ اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں۔رسالے کے مشمولات انوکھے انداز سے مزین ہیں۔رپورتاژ اب تو بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی ہے۔لیکن آپ نے اس صنف کے تئیں اپنی دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔آپ نے نوجوانوں کو پیروں کا استاذ کیا ہے۔بعض تحریریں کمزور اور قابل گرفت بھی ہیں لیکن کوششیں کبھی ضائع نہیں جاتیں۔نور فاطمہ،سفینہ بیگم،اور ثوبان سعید کے مضامین اپنی تازگی اور دلکش طرز اسلوب کے سبب اچھی لگیں۔ان تحریروں سے نئی نسل مختلف جامعات کی علمی،ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے آشنا ہوگی۔''اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے'' میں محبوب حسن نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔بقول محبوب حسن'' گیلی لکڑی کی طرح سلگنا اہل غم کے لیے زندگی کی معراج ہے......عشق کا سفر اکثر شہد کی مٹھاس سے شروع ہو کر نیم کی کڑواہٹ کے ساتھ ختم ہوتا ہے......دل میں صبر ایوبی سمیٹے ایک عاشق گونگے کی زندگی بسر کرتا ہے۔'' مضمون میں ایسے بہت سے فکر انگیز اور قابل غور جملے موجود ہیں۔لیکن میری دعا ہے کہ خدا نوجوانوں کو ایسے تباہ کن عشق سے محفوظ رکھے۔آمین! سفینہ بیگم اور صالحہ صدیقی کے یہاں بھی تخلیقیت کے امکانات موجود ہیں۔دوسری ادبیات کے تحت جو مشمولات موجود ہیں،ان میں بھی دلچسپی کے عناصر موجود ہیں۔مختصر یہ کہ ''نیا دور'' اپنے مخصوص مواد اور مشمولات کے باعث صرف کتب خانوں کی زینت نہیں بنے گا بلکہ بار بار پڑھنے پر مجبور کرے گا۔میں اردو کے اس انوکھے رسالے کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔شکریہ!

جعفر آفاقی

نزد اٹالہ مسجد (جونپور)

نیا دور کا مستقل قاری ہوں اور رسالے کا انتظار شدت سے رہتا ہے۔آج کل چاروں سمتوں میں آپ کی جس قدر پذیرائی اور تحسین ہو رہی ہے،ایسی صورت میں آپ کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کی مانند ہے۔اس قدر بے پناہ تعریف وتوصیف کے بعد عام طور پر لوگ سست پڑ جاتے ہی لیکن آپ دن بہ دن جدت پسندی کی راہوں پر گامزن ہیں۔میں نیا دور اور ادارے کے جملہ اراکین خصوصاً سہیل وحید صاحب کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

مارچ کا شمارہ ذرا دیر سے موصول ہوا۔لیکن دیر آید درست آید۔روایت کے برعکس یہ شمارہ نئی جہتوں سے ہم آہنگ ہے۔اس میں صنف رپورتاژ کے حوالے سے خاصہ مواد شامل ہے۔لیکن ایک کمی ضرور محسوس ہوئی کہ اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے کئی مضامین شامل ہیں۔بہتر ہوتا کہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں پر بھی مضامین لکھے جاتے۔رپورتاژ کے حوالے سے شائع شدہ بیشتر مضامین کے عنوانات پسند نہیں آئے۔ان میں تخلیقی قدروں اور جمالیاتی حسن کا بھی فقدان ہے۔اسی لیے بعض اوقات بوجھل پن کا احساس ہوا۔اسلم جمشید پوری،ثوبان اور نور فاطمہ کی تحریریں بہ نسبت اچھی لگیں۔

محبوب حسن نے بھی اپنے شگفتہ طرز نگارش کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔'ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے' پڑھ کر طبیعت شاداب ہو گئی۔بیگم کے اصرار پر انھیں بھی پڑھ کر سنایا اور پھر ہم دونوں دیر تک اپنے اپنے معاشقے سے پردہ اٹھاتے رہے۔انہوں نے رہ عشق میں ملنے والی سبق آموز بے وفائی کو انوکھے اور پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔خدا جانے انہوں نے کس بنیاد پر لکھا ہے کہ ''شاعری اور عشق کے درمیان کرتے و پائجامہ کا رشتہ ہوتا ہے۔یعنی کرتے کے بغیر پائجامہ تنہا کسی کھونٹی کی نذر ہوتا ہے۔'' اس عمدہ تحریر کے لیے میں موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

علاوہ ازیں اسٹیفن لیلاک اور حمید دلوائی کی تخلیقات بھی قابل مطالعہ ہیں۔شمارے میں مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش بھی سلیقے سے پیش کی گئی ہے۔تبصرہ نگاری کا گوشہ بھی قابل مطالعہ ہے۔خاص طور پر ''رقص صدا'' کے حوالے سے لکھا گیا ڈاکٹر ذکی طارق کا تبصرہ بہت عمدہ ہے۔وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ افسانچے کی جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مظلوم قیصر سنبھلی

(غازی آباد)،یوپی

نیا دور سے میرا تعلق دیرینہ ہے ماہ مارچ ۲۰۱۸ء کا تازہ ترین شمارہ فرحت بخش اور قابل تحسین ہے۔تقریباً ایک سال سے رسالہ متواتر ہمارے ذاتی کتب خانہ کی زیب و زینت بن رہا ہے۔فروری ۲۰۱۸ء کا شمارہ بشیر بدر و ندا فاضلی کی حیات و شاعری کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو قابل آفریں ہے۔بغیر کسی تامل کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیا دور ایک نئے دور سے گزر رہا ہے۔مبارک باد کے مستحق ہیں سہیل وحید صاحب اور جملہ اراکین جن کی مخلصانہ کاوشوں نے چار چاند لگا دیا ہے۔اصغر گونڈوی کے کلام کا انتخاب دیدہ زیب ہے۔اسلم جمشید پوری،طلعت گل،محبوب حسن اور سفینہ بیگم کے مضامین بھی تعریف کے مستحق ہیں۔دیگر مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔مجموعی طور پر رسالہ بہت سی خوبیوں کا جامع ہے جس کے لئے مزید ایک بار اور مبارک باد قبول کریں۔

جاوید احسن

ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی

اترپردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ میں ایچ ٹی وومن ایوارڈ-۲۰۱۸ء میں انعام یافتگان کے ساتھ (۲۹/اپریل ۲۰۱۸ء)

اترپردیش کے نائب وزیراعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ میں اردو میڈیا سینٹر کا افتتاح کے پروگرام میں خطاب کرتے ہوئے (۷/مئی ۲۰۱۸ء)

اترپردیش کے نائب وزیراعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ میں اردو میڈیا سینٹر کا افتتاح کے موقع پر (۷/مئی ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما لکھنؤ میں
ڈاکٹر امبیڈکر کے ۱۲۷ویں یوم ولادت کے موقع پر 'ڈاکٹر امبیڈکر: ساماجک وچار اور درشن' کا اجراء کرتے ہوئے (۱۴/اپریل ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما لکھنؤ میں
ڈاکٹر امبیڈکر کے ۱۲۷ویں یوم ولادت کے موقع پر انعام یافتگان کے ساتھ (۱۴/اپریل ۲۰۱۸ء)

نیادور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 01
मई 2018
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, डॉ0 उज्ज्वल कुमार, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद